شادی کے سلسلہ میں جہیز
نقد رقم کا مطالبہ
از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، تقطیع متوسط، کاغذ
کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴۰، قیمت دو روپیے
(۱) امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار (۲) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ
س نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

ں زمانہ میں جہیز وغیرہ کے مطالبہ کی وجہ سے بچیوں کی شادی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور دشوار
ہے۔ اس پر دردمند اور ذمہ دار علما اور مسلمانوں کی تشویش واضطراب بالکل بجا ہے۔
بچہ میں حدیثوں کے علاوہ فقہا اور مفتیوں کے اقوال سے یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ ایسے مطال
پر ملنے والی رقم شرعاً رشوت ہوگی جس کا لینا دینا اور اس کے لیے واسطہ بننا سب
، اور از روے حدیث ایسے سب لوگ ملعون ہوتے ہیں"۔ اسلام کے معاشرتی
عائلی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر فاضل مصنف کی اچھی اور گہری نظر ہے۔ اس لئے
نے اس مسئلہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ کتابچہ اس لائق ہے کہ اس کی زیادہ
اشاعت ہو۔ اور یہ ہر مسلمان کے مطالعہ میں بھی آئے۔

س آئینہ :۔ از جناب غوث محمد غوثی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت
صفحات ۲۳۰ مع خوبصورت کور۔ قیمت ۳۵ روپے پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اد مارکیٹ، علی گڑھ، (۲) غوث محمد غوثی، سرائے رحمن، علی گڑھ۔

س آئینہ" جناب غوث محمد غوثی کی غزلوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ انھیں تغزل سے زیادہ
۔ اور یہ مجموعہ متعدد اچھی اور کامیاب غزلوں پر مشتمل ہے اور اس سے مصنف کی فن پر قدرت
یان کے سلیقہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک پختہ مشق شاعر ہیں اور انھوں نے عصری میلانات کو قدیم
ہ باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر سے ان کے انداز طبیعت اور رنگ
ازہ ہوگا ؎

ب محفل خالی از ذوق جہاں ہوں گے   مرے نغمے وہاں ذوق سماعت پر گراں ہوں گے
[illegible]
"ض"

جلد ۱۳۹، ماہ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۶ء عدد ۶

مضامین

شذرات   سید صباح الدین عبد الرحمٰن   ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

اسلام کی معاشرتی زندگی مستشرقین کی نظر میں   ڈاکٹر عبد الوہاب ابوحدیبہ ڈائرکٹر مرکز الدراسات الاقتصادیہ۔ تونس۔   ۴۰۵-۴۲۴
مترجمہ حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین
عربی زبان وادب میں ہندوستانی علماء کا حصہ   عالی جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ   ۴۲۵-۴۳۷
ابلیس وبشر اور اقبال   ڈاکٹر محمد منصور عالم شعبۂ اردو وفارسی مگدھ یونیورسٹی۔ بہار   ۴۳۸-۴۶۲
القول الجلی واسرار الخفی کا نسخہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ   جناب فضیل احمد قادری خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ   ۴۶۳-۴۷۴
مطبوعات جدیدہ   "ض"   ۴۷۵-۴۷۶

بابری مسجد

اس رسالہ میں اجودھیا کی تاریخی بابری مسجد کے مالہ وماعلیہ پر تاریخ کی کتابوں، حق پسند ہندوؤں کے بیانوں اور عدالتوں کے فیصلوں کی مدد سے نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :۔ ۲۰ روپے

شذرات

کچھ قدر دانوں اور مداحوں نے شکاگو (امریکہ) میں امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ کے نام سے
ہے، جس کی نگرانی میں ۲۹ مئی ۱۹۸۶ء سے ۲ جون ۱۹۸۶ء تک ایک بین الاقوامی
خسرو کی مقبولیت اور محبوبیت کی دلیل ہے کہ ان کے مولد، مسکن اور مرقد سے بہت دور
کے کارناموں پر عقیدت کے پھول نچھاور کئے گئے۔

کے اصل روح رواں ہندوستان اور پاکستان کے اولو العزم اور جوان ہمت افراد ہیں گو امریکہ
کا تعاون بھی اس کو حاصل ہے، اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں جو لوگ ہیں، ان کے
رست ہے، اس کے صدر جناب ڈاکٹر حبیب الدین احمد ہیں جو حیدرآباد کے رہنے والے ہیں
ی انجنیئر ہیں، اس کی آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر جناب نقی اختر صاحب ہیں، جو پاکستانی ہیں، اور
استاد ہیں، اس کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر ظفر اقبال تھے، جو لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق استاد جب
کے لڑکے ہیں، اور وہاں ایک سائنس داں کی حیثیت سے مشہور ہیں، کچھ کتابوں کے مصنف
یو ڈائرکٹر ایک امریکن وڈ مین ٹیلر ہیں جو کانفرنس کے ہر کام کو انجام دینے میں بڑی تندہی سے
الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے ہر جگہ کے اہل علم بلائے گئے، جس میں ہندوستان سے
بنگلہ دیش سے ایک اور پھر امریکہ کے کچھ نمائندے شریک ہوئے، ہرورڈ یونیورسٹی کی
شمیل کی شرکت کی وجہ سے اس میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہو گیا تھا، میرے نام بھی دعوت
سائٹی آف امریکہ کے ایما پر جناب حکیم عبد الحمید صاحب ہمدرد نگر تغلق آباد دہلی نے اپنی بے پایاں کرم گستری اور
میرے سفر کے اخراجات برداشت کیے، جس کے لیے ان کا بے حد شکر گذار ہوا، شکاگو سے خبر ملی تھی
ہوائی جہاز سے، ۲ مئی کو جگہ مخصوص کر دی گئی ہے، لیکن بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے اعظم گڈھ سے
امریکہ کے سفارت خانہ سے ویزا نہ مل سکا، میرے لڑکے شاکر الرحمٰن نے اپنی مستعدی اور کوشش سے

۲۸ مئی کو تھائی لینڈ کے ہوائی جہاز ٹی۔ جی۔ ۱۹ میں جگہ مخصوص کرائی، دوسرے دن امریکہ کے سفارت خانہ سے دو گھنٹے کے اندر ویزا مل گیا، جس آسانی، عزت اور باوقار طریقہ سے، اس روز تقریباً پانچ سو آدمیوں کو ویزے دیئے گئے، اس سے پاکستان کے سفارت خانہ کو درس لینا چاہیے، جہاں ویزا حاصل کرنا بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے، سفر میں جو اور دشواریاں پیش آئیں، ان کو جناب اوصاف علی صاحب ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر دہلی نے دور کر دیں، جس کے لیے ان کا بھی شکر گذار ہوا، ۲۸ مئی کو تین بجے رات کو ہوائی جہاز میں بیٹھا، لندن میں اس ہوائی جہاز کو چھوڑ کر ٹی۔ ڈبلیو۔ اے کے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر شکاگو جانا تھا، لندن کے ہوائی اڈے پر عملہ نہایت اخلاق سے پیش آیا، تین گھنٹے انتظار کے بعد شکاگو کے لیے ہوائی جہاز پر بیٹھا تو لندن میں اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے، ۸ گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد شکاگو پہونچا تو وہاں دن کے ڈیڑھ بجے تھے، ٹیلیفون سے امیر خسرو سوسائٹی والوں کو خبر دی تو ایک گھنٹہ کے اندر سوسائٹی کے ایک بہت سرگرم، مستعد اور متحرک رکن جناب محمد عبد الحق صاحب پہونچ گئے، جو وہاں انجنیئر ہیں، ان کو سراپا اخلاق، اخلاص اور محبت پایا، وہ اپنے ساتھ پہلے سوسائٹی کے ایک معزز رکن ڈاکٹر محمد ایم فاروقی کی رہائش گاہ پر لے گئے، جہاں ممبئی سے جناب ظ۔ انصاری اور شانتی نکیتن سے جناب پروفیسر محمد طاہر علی آکر ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں پاکستان کے جناب عبد الصمد حسین رضوی سے ملاقات ہوئی، یہاں سے جناب عبد الحق صاحب وہاں لے گئے جہاں میرے قیام کا انتظام تھا، یہ ڈاکٹر نوید مشرف کا خوبصورت بنگلہ تھا، ان کا آبائی وطن تو دہلی تھا، مگر اب ان کا خاندان اسلام آباد پاکستان میں آباد ہو گیا ہے، وہ تقریباً سات سال سے شکاگو میں ڈاکٹر ہیں، ان کی بیگم صاحبہ فلپائن کی ہیں، دونوں بڑی خندہ پیشانی اور ہر قسم کے لطف و کرم کے ساتھ پورے قیام کے زمانے میں پیش آئے، جس سے یہ سفر اور خوشگوار رہا، اگر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتا تو اتنا آرام نہیں ملتا جتنا یہاں ملا، یہیں جناب عبد الصمد حسین رضوی کا بھی قیام رہا، وہ کراچی سے آئے ہوئے تھے، وہاں چیف انجنیئر ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں، ان کا آبائی وطن علی گڈھ تھا۔

۲۹ مئی کو جمعہ تھا، جمعہ کی نماز ایک چیپل یعنی چھوٹے گرجا کے ایک گوشہ میں پڑھی، کیونکہ قریب کوئی مسجد نہ تھی، نماز پروفیسر فضل الرحمان نے پڑھائی جو پہلے اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے، اب شکاگو کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اسی کے بعد کانفرنس کا افتتاح تھا، وہاں جانے سے پہلے قیام گاہ پر

ون آیا کہ میں امیر خسرو کی عبقریت پر ایک مقالہ تیار کر کے کانفرنس کے لیے
قالہ ایک دوسرے موضوع پر لکھ کر لایا تھا، جناب حبیب الدین احمد کی فرمائش
سے تین چار گھنٹے کی محنت میں تیار ہو گیا، کانفرنس کے نمائندوں کا خیر مقدم
تاح جناب تقی اختر کی صدارت میں ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر اینے میری شمیل
سے پہلے پاکستان اور ہندوستان میں ان کی تقریریں سن چکا تھا مگر اس روز
رو کی کچھ خاص خاص باتیں زبانی کہہ کر بیٹھ گئیں، اس کے کچھ وقفہ کے بعد
وا، تو اس کی ابتدا میرے مقالہ ہی سے کی گئی، جو چند گھنٹے پہلے لکھا گیا تھا۔
رین احمد نے مجھ سے مل کر کہا آپ تو معلومات کے سمندر ہیں۔

ڑھے گئے، وہ یہ تھے، امیر خسرو کا عشق از پروفیسر شمس الدین دہری نگر کشمیر،
نور الحسن انصاری (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر انصاری نے اپنا مقالہ موثر انداز
یا گیا، ان مقالوں پر تبصرہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے ماہرانہ انداز میں
ینے میری شمیل سب سے بے تکلفانہ انداز میں ملتی رہیں، مجھ سے ملیں تو کہنے لگیں
اشدی مرحوم آپ کے بہت قدرداں اور مشتاق رہے۔

ان سے کانفرنس کے جلسہ کی جگہ تقریباً تیس میل دور واقع تھی آنے جانے میں
ت جھیل کے کنارے آباد ہے جھیل کاہے کو ہے، ایک طویل دریا ہے یہ شہر زیادہ تر
ابق بسایا گیا ہے، درخت جنگل اور ڈھلوان ٹیلے پہلے ہی کی طرح محفوظ رکھے گئے ہیں
ور کراچی کی طرح بڑے بڑے محل نما نہیں ہیں، ضرورت کے مطابق اوسط درجے
ائش کے سارے سامان ہوتے ہیں، سڑکوں پر صرف موٹریں دکھائی دیتی ہیں۔
کل پر سوار نہیں دیکھا، پٹرول بہت ہے، جس قیمت پر ہندوستان میں ایک لیٹر
اتا ہے۔

قالہ خوانی کا دوسرا اجلاس شکاگو یونیورسٹی کے ایک کمرہ میں ہوا، یہ شکاگو کی

بہترین یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے، اس کی شاندار عمارت اور اس کے مختلف کمروں کی زینت و آرائش کو دیکھ کر یہاں کی تعلیم کی اہمیت کا خود بخود اندازہ ہو گیا، اس یونیورسٹی کے علاوہ شہر میں بہت سی اور یونیورسٹیاں ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی، دوسرے اجلاس کے خصوصی مہمان پروفیسر نجیب الرحمٰن تھے، جو اس وقت اوکلینڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اس میں ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) نے امیر خسرو اور ہائے مختفی کے استعمال پر بڑا پر مغز مقالہ پڑھا جس کو شکاگو یونیورسٹی کے ایرانی پروفیسر حشمت معید نے خاص طور سے پسند کیا، اسی کے بعد خود ڈاکٹر حشمت نے ہفت اختر کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا، جس میں یہ دکھایا کہ اس میں عبدی بیگ نے امیر خسرو سے کیا کیا چیزیں لی ہیں، جناب نثار انصاری صاحب بمبئی سے خسرویات کی وہ ساری چیزیں نمائش کے لیے ساتھ لائے تھے، جو ۱۹۷۶ء میں دہلی میں خسرو کے سات سو سالہ جشن کے موقع پر جمع کی گئی تھیں، اس اجلاس میں ان کا مقالہ اس عنوان پر تھا کہ ایک منتشر معاشرہ میں ایک عبقری کے سامنے کیا کیا مسائل ہوتے ہیں، اسی روشنی میں امیر خسرو کو پیش کیا، اس کے بعد جناب عبدالصمد حسین رضوی نے اپنا مقالہ امیر خسرو کی ایجاد کردہ منجمانہ شاعری کے عنوان سے پڑھا، اور زبانی بے شمار اشعار سنائے جن سے سامعین حیرت زدہ تھے، وہ امیر خسرو کے زائچے اور جداول کو لنٹرن کے ذریعہ سے بھی دکھاتے جا رہے تھے۔

اسی روز اس سلسلہ کا دوسرا اجلاس سہ پہر کو شروع ہوا، تو امیر خسرو کی ہندی اور اردو شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی، پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی یونیورسٹی)، اپنی کتاب امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر پر تقریباً ایک گھنٹہ تک انگریزی میں پوری طلاقت لسانی سے بولے، یہ کتاب امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ نے اپنی طرف سے شائع بھی کر دی ہے، اس میں ذخیرۂ اسپرنگر سے جو پہیلیاں جمع کر دی گئی ہیں ان کے متعلق پروفیسر نارنگ کی رائے ہے کہ اس میں کچھ پہیلیاں ایسی ہیں، جو الحاقی ہیں، تو بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس کو غیر معتبر سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، اس کے بعد جناب شجاعت علی سندیلوی نے امیر خسرو کی ہندی شاعری پر اپنا مقالہ پیش کیا، انھوں نے امیر خسرو کے ہندی کلام کا ایک مجموعہ ہندی زبان میں مرتب کیا ہے، اس کو بھی امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ نے اپنی طرف سے شائع کیا ہے، جناب شجاعت علی سندیلوی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی پروفیسر شریف النساء نے مقالہ امیر خسرو اور ہندوستانی کلچر کی جھلکیاں کے عنوان سے پڑھا۔

اسی رات کو شکاگو یونیورسٹی کے انٹرنیشنل ہال میں ایک پرتکلف استقبالیہ دعوت ہوئی، جس میں پاکستان کے قونصل اور بنگلہ دیش کے جناب بدر الدجیٰ بھی شریک ہوئے، اس میں کلیدی خطبہ امریکہ کی

ے یونیورسٹی کے ڈاکٹر گورڈن ایچ لیمب کا تھا، اس کی ابتداء ڈاکٹر آصف زمانی
ی غزل کو بڑے اچھے ترنم کے ساتھ پیش کرکے کی، اس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ندیلوی کی کتابوں کا اجراء بھی ہوا، پھر اپنے میری شمیل کو نشانِ خسرو، ڈاکٹر نذیر احمد
رجناب شجاعت علی سندیلوی کو نذرِ خسرو کے اوارڈ امیر خسرو سوسائٹی امریکہ کی
شیو کمار شرما ستار نواز کو اور ذاکر خاں طبلہ نواز کو بھی اوارڈ دئے گئے۔

نی کے اجلاس میں پروفیسر فضل الرحمٰن نے ایک مقالہ پڑھا جس میں سماع کا زیادہ
ر کشفی (کراچی یونیورسٹی) نے امیر خسرو اور تصوف پر ایک دل نواز مقالہ اردو
ری شمیل نے امیر خسرو خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید کی حیثیت سے کے عنوان
ہار کیا، بحث و مباحثہ کے موقع پر میں نے سماع اور مزامیر پر جب اپنی اس رائے
ین اور شریعت پسند صوفیائے کرام مزامیر کے ساتھ سماع کو جائز قرار نہیں دیتے
ے پسند نہ آئی، مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جنھوں نے میری تائید کرتے ہوئے کہا کہ
وتا ہے، بدلا نہیں جاسکتا ہے۔

ں میں جناب شہاب سرمدی (علی گڈھ) اور میرا مقالہ امیر خسرو کی موسیقی پڑھا، جناب
یا کہ اعجاز خسروی میں موسیقی پر جو باب ہے، اس کا انگریزی ترجمہ انھوں نے کرلیا
پا گیا ہے، اس ترجمہ کے بعد امیر خسرو کی موسیقی کے کمالات کے فن کو سمجھنے میں
ہ اعجاز خسروی کی پرتکلف صنائع بدائع اور استعارات و تشبیہات سے بھری ہوئی
ں فن گم ہوکر رہ گیا ہے، میں نے بھی اسی اعجاز خسروی اور امیر خسرو کی مثنویوں کے ذریعہ
طالعہ کرنے کی کوشش کی، اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر ریان سلو ر تھے، جو دانس
ردو شعبہ کے انچارج ہیں، اور موسیقی کے بھی استاد ہیں، وہ میرے مقالہ پر دیر تک باتیں
ے، میں نے ان سے عرض کیا کہ امیر خسرو کی ہر چیز سے مجھکو دلچسپی رہی ہے، اس لیے میں نے
رت ایک اسکالر کی حیثیت سے، ماہر موسیقی کی حیثیت سے نہیں کیا ہے، امیر خسرو کی

موسیقی پر کلیفورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے. انڈریو گریگ اور کراچی کی افسر حسین صاحب نے بھی مقالے پڑھے۔

آخری اجلاس ۷ر جون کو ہوا، جس میں کراچی کے پروفیسر ممتاز حسین نے امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تعلقات پر بعض تکلیف دہ رائے کا اظہار کیا، بنگلہ دیش کی کلثوم اے. بشر مزامدار نے امیر خسرو کی تمام مثنویوں پر اپنے انداز میں تبصرہ کیا، ان کا مقالہ اردو میں تھا، جس کو سن کر تعجب ہوا، مگر معلوم ہوا کہ وہ بمبئی کی ہیں، ان کی شادی بنگلہ دیش میں ہوئی ہے، دہلی کے شیخ سلیم احمد نے خسرو کے شعری کارناموں پر اپنی رائے کا اظہار کیا، لکھنؤ کی آصفہ زمانی نے مثنوی دول رانی اور خضر خان پر ایک مقالہ پیش کیا، لندن یونیورسٹی کے ضیاء الدین شکیب نے یہ بتایا کہ یورپ میں رہ کر اردو پڑھانے میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں، حیدر آباد کے ڈاکٹر مغنی تبسم نے امیر خسرو کی شاعری کو فن کی حیثیت سے باضابطہ چارٹ کے ذریعہ سے سمجھایا، جو یقیناً بہت ہی محنت سے تیار ہوا تھا۔

اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ امیر خسرو کی اعجاز خسروی کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے، اس مشکل کام کے نگراں علی گڈھ کے ڈاکٹر نذیر احمد مقرر ہوئے، افغانستان کے ڈاکٹر عبد الغفور فرہادی نے دول رانی اور خضر خان کا انگریزی ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی، ایران کے ڈاکٹر حشمت معید نے خسرو اور نظامی کا تقابلی مطالعہ کرنے پر زور دیا، یہ بھی طے پایا کہ امریکہ کی یونیورسٹی میں امیر خسرو کے مختلف علمی نثری اور شعری کارناموں پر باضابطہ ریسرچ کئے جائیں، اس کا دوسرا اجلاس دو سال کے بعد ۱۹۸۹ء میں ہوگا، ہر روز کی اجلاس کی کارروائیوں کو سنجیدہ اور باوقار بنانے میں جناب حبیب الدین احمد صاحب جانگسل محنت کرتے رہے، وہ امیر خسرو کے کارناموں کے بڑے دلدادہ نظر آئے، اختتامی اجلاس کو جناب نقی اختر صاحب نے اپنی ایک مختصر لیکن بہت مناسب تقریر سے مخاطب کیا، مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب حبیب الدین احمد صاحب کی ریاضت، عرق ریزی اور لگن کی بڑی تعریف کی جس کا اعتراف تمام بیرونی نمائندوں کو بھی تھا، آخر میں نقی اختر صاحب سب سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے، تو مندوبین کانفرنس کی کامیابی پر تمام عہدہ داروں اور کارکنوں کو مبارکباد پیش کر رہے تھے، اور ہم میں سے ہر فرد اس کی یادوں کی شمع ذہن میں روشن کرتا ہوا، ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہا تھا۔ شکاگو میں آٹھ روز قیام رہا، شہر کے اہم مقامات کی

ق اور پھر اپنے میزبان ڈاکٹر نوید مشرف کی معیت میں کی، وہاں کی سب سے عجوبہ روزگار عمارت
ں میں ایک سو دس منزلیں ہیں، ڈاکٹر نوید مشرف اس کی ایک سو سات منزلوں تک
کے ذریعہ سے لے گئے، اس کی حیرت انگیز چیز یہ نظر آئی کہ ہر منزل پر خرید و فروخت کی دکانیں
یک چھوٹا سا بارونق شہر آباد دکھائی دیتا ہے تماشائیوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے، انجینیرنگ کا
یں آیا، شہر کا میوزیم بھی دیکھا، جہاں انسان کی لاشیں بھی شاید قبروں سے نکال کر رکھی گئی
ہر میں زیادہ دلچسپی بہائیوں کی شاندار عبادت گاہ سے ہوئی، ایک گنبد کی عمارت ہے
و آرائش میں اربوں روپیے خرچ ہوئے ہوں گے، ایک فلم کے پردے پر ہر تھوڑی دیر
ہب کی خصوصیت بتائی جا رہی تھی، اس کے بانی بہاء اللہ اپنے پیغمبر ہونے کا دعویٰ
ی تعلیم یہ تھی کہ ہر مذہب اپنی جگہ پر صحیح ہے، اس لیے ہر مذہب کی تعلیمات کو بہائی مذہب
لیا ہے، ہم لوگوں کو جو فلم دکھائی گئی، اس میں بتایا گیا کہ پوری دنیا میں اس مذہب کی
ں ہزار عبادت گاہیں اب تک بنائی جا چکی ہیں، عبادت کرنے میں ہر مذہب کے پیرو کو
ں کا انداز اختیار کرنے کی اجازت ہے، بڑے بڑے ہال اور کمروں میں خوبصورت کرسیاں
، وہیں مذہبی اجتماع ہوتا ہے، اور وہی شاید ان کی عبادت ہے، ہم لوگوں کو بتایا گیا کہ
ہائی تنظیم ایک مجلس کی نگرانی میں کام کرتی ہے، شکاگو میں مسجدیں تو جابجا ضرور ہیں،
ب کے عبادت خانہ کی طرح کوئی مسجد نہیں۔

مختصر قیام میں برق و بخارات کے حیرت انگیز کارناموں کے ساتھ درخشندہ فلزات، بے چشمہ
ت، رعنائی، تعمیر میں رونق ہے، صفائی، گرجوں سے بہتر بنگلوں کی عمارات، عریانی اور
مدنیت کے فتوحات اور ساحر و مینا کے کرامات بھی دیکھے، مگر جب قیام گاہ سے مسٹر نوید
محبت سے رخصت کیا، اور ہوائی اڈے پر جناب عبدالحق اور ڈاکٹر نوید مشرف نے
انداز میں اپنی یادوں کا معطر معطر ہار پہنا کر رخصت کیا تو معلوم ہوا کہ شکاگو بھی اپنے
ا شہر ہے۔

مقالات

اسلام کی معاشرتی زندگی مستشرقین کی نظر میں

از

ڈاکٹر عبدالوہاب ابوحدیبہ ڈائرکٹر مرکز الدراسات والابحاث الاقتصادیہ والاجتماعیہ، تونس

ترجمہ: حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی، رفیق دارالمصنفین

مستشرقین نے اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے رسوم اور رواجوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں اگر اسلام کے حقیقی تمدن اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو ان مستشرقین کے خیالات اور ان کی تحریروں کی تصدیق نہایت دشوار ہوگی۔

ہمارے اور مستشرقین کے نقطۂ نظر میں فرق اور اختلاف کا ہونا اس لحاظ سے فطری ہے کہ ہم اپنے ماحول اور اپنی تہذیبی قدروں اور ثقافتی روایتوں سے مانوس ہیں، اور وہ مادی، فکری اور معاشرتی اعتبار سے ہم سے جدا ہیں، وہ ہماری تہذیب کا مطالعہ اور تجزیہ بھی دور سے کرتے ہیں، لیکن ہمارے لیے ان مستشرقین کی رایوں اور تحریروں کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس طرح ہم کو اپنی تصویر پر ایک نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے، اس سے قطع نظر کہ یہ تصویر کتنی صحیح ہے، اور کس قدر مسخ اور غلط ہے۔

مختلف تہذیبوں کے درمیان موازنہ کیا جاتا رہا ہے، اور جب تہذیبیں ایک دوسرے سے قریب ہوتی ہیں تو موازنہ کا یہ عمل تیز تر ہو جاتا ہے، اسلامی تہذیب و ثقافت کا بھی جب

ے ہٹ کر علمی اور اصولی لحاظ سے تجزیہ کیا گیا تو وہ ایک صاف شفاف
لیکن جب تحلیل و تنقید کے اس عمل کی تہ میں نفرت، عداوت اور باطنی
اسلامی تہذیب کے خط و خال کو داغدار کر کے پیش کیا گیا۔

پنے مغربی ماحول میں جب اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کی معاشرتی زندگی
ا سے کیا تو وہ خود کو تعصب اور باہمی آویزش کے اثرات سے آزاد نہیں
وں نے باقاعدہ ایک منصوبہ کے تحت حقائق کو دوسرے زاویۂ نگاہ
بار آلود کیا اور اسلامی طرز زندگی، فکر اسلامی کے عناصر اور اسلام کے
وں سے الزام تراشی کی، عجیب بات یہ ہے کہ تلبیس و تحریف کا یہ انداز
ہو جاتا ہے، یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ ہمارے خلاف جو کتابیں اور
ان کی اشاعت اور ان کا اثر و نفوذ ان کتابوں سے کہیں زیادہ ہے
ت کا نتیجہ ہیں، عوام کے علاوہ خواص بھی ایسی کتابوں سے زیادہ متاثر
ے علمی حلقے جن کا عالم اسلام سے گہرا تعلق ہے وہ بھی ایسے غلط،
قصے کہانیوں اور روایتوں سے متاثر نظر آتے ہیں جن کو مستشرقین
کے تحت اسلامی تہذیب کے نام پر پیش کرتے ہیں، ہمارے علمی حلقوں
ے بڑے خطرہ کی علامت ہے، اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے
ت اور ان کی تحریروں کا سنجیدگی اور گہرائی سے جائزہ لیا جائے، تاکہ
ان الزاموں کا جواب دیا جا سکے، اور اصل حقیقت کو بھی عملی
یا جا سکے، ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ نے ان مستشرقین کی کتابوں
یادہ پڑھا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ان کے ذہنوں میں اپنی تہذیب

و ثقافت سے متعلق شکوک و شبہات بلکہ نفرت و بیزاری کے جذبات پیدا ہوئے ہیں اس لیے ان مستشرقین کے خیالات کا محاسبہ اور بھی ضروری ہے تاکہ ہماری یہ نئی نسل اپنی قومی حمیت، اپنی تہذیب کی شایستگی و شرافت اور اپنے تاریخی ورثہ کی اصالت اور سچائی پر اپنے ایمان کو تازہ اور پختہ کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ پورے استشراق کے لٹریچر کو مکمل اور باضابطہ طور پر علمی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے، ان کے ادب کی تمام قسموں اور مختلف زبانوں میں متنوع موضوعات پر ان کی جتنی بھی کتابیں شایع ہوتی ہیں ان سے باخبر رہا جائے، اسی طرح ایسے بہت سے مسلمان مصنفین ہیں جن کی تحریروں اور طرز فکر میں مستشرقین کے خیالات کا عکس جھلکتا ہے تو ایسے مسلمان اہل قلم اور مصنفین کی کتابوں کا بھی سنجیدگی سے جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

استشراق کیا ہے؟ یہ درحقیقت مختلف بلکہ متضاد افکار و نظریات کے مجموعہ کا نام ہے، وقت اور ماحول کی مناسبت سے اس پر کبھی موضوعیت، کبھی غیر جانبداری، کبھی تحقیق اور صاف گوئی اور کبھی علم کے ناموں کے خوبصورت غلاف چڑھا دیے جاتے ہیں، ان پردوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کو حقیقت کے اصل چہرہ سے بے خبر رکھا جائے چنانچہ تنقید و تجزیہ کے نام پر موضوع سے جو انحراف کیا جاتا ہے اور مستند معلومات کا جو فقدان رہتا ہے، اور غیر اہم واقعات سے اہم نتائج کو اخذ کرنے میں جو عجلت کی جاتی ہے ان تمام علمی نقائص سے قاری کو ناواقف رکھنے میں یہ علمی غلاف بڑی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن مستشرقین کی تحریروں کے یہ نقائص اور کمزوریاں اب اس طرح کھل کر سامنے آ رہی ہیں جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مستشرقین کی کتابیں اور تحریریں صحیح اور غلط معلومات کا مرکب ہیں، اب مستشرقین

ں رہا ہے کہ وہ یورپ کے تنگ آسمان کے نیچے تعصب اور جانبداری کے
ور پر گردش کرتے رہیں، اور پھر اس عمل کو وہ علمی موضوعیت کا نام بھی دیں
ں نسلوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے بارہ میں جو واقفیت حاصل کی،
ی تحریروں کے ذریعہ حاصل کی، بعض مستشرقین کی کتابیں بار بار شایع ہوئیں
ن کے ترجمے بھی ہوئے، عربی زبان میں بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا، ایسی
سلام الجنسیہ" ہے، جس کے مصنف جارج بوسکی ہیں، یہ وہ کتاب ہے جس کو
ے قارئین پڑھتے چلے آئے ہیں، یہ یورپ کے نامور محققین کی نگرانی میں شایع
رجمہ انگریزی، اسپینی اور ہالینڈ کی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے، اس کتاب
کی معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو سے متعلق نہیں ہے جس کے بارے میں
ب دشوار، مشکل اور پیچیدہ اور بحث طلب مسئلہ ہے، اور اسلامی تہذیب
یے اس موضوع کو سمجھنے اور اس کے تحلیل وتجزیہ میں ایک مدت صرف ہوتی
ں اس نہایت اہم کتاب کا موضوع مسلمانوں کی جنسی زندگی ہے، اس کے
دعویٰ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر بہت محنت کی ہے اور بہت زیادہ
ہم کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں فقہ اسلامی کی کئی بنیادی کتابوں سے مدد لی
مطابق ان کی نظر فقہ اسلامی کے ایک ماہر اور باخبر عالم کی نظر ہے، ان کا
ر اب فقہ اسلامی سے اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس کی حیثیت ایک فراموش شدہ
ر مسلمانوں کے جدید متمدن طبقہ میں اسے طاق نسیان پر رکھ دیا گیا ہے،
علم الاجتماع اور علم نفسیات کے ماہرین کے لیے ایک بنیادی مرجع کی حیثیت
کے نتیجہ میں اس کتاب کو مطلوبہ اہمیت حاصل ہوگئی، اور اب اس موضوع پر

کام کرنے والوں کے لیے خواہ وہ مستشرق ہوں یا مسلمان اہل قلم ہوں اس کتاب پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہو گیا، اور افسوس یہ ہے کہ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ لوگوں نے اس کتاب کی ان خامیوں اور غلط اور غیر مستند باتوں پر تنقید کی نگاہ ڈالی ہو، جن کو بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اس کتاب میں چھپا دیا گیا ہے، مسلمانوں کی جنسی زندگی، ان کے عہد شباب کے میلانات، ان کی لذت اندوزی اور اس کے لیے ان کی تگ ودو وغیرہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے، جس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا ہے، وہ جنسی معاملے میں بے صبر اور بے قید ہے، اور اس کے لیے وہ خود قانون و اخلاق کے دائرے بناتا اور سمیٹتا ہے، جارج بوسکی اپنے اس نتیجہ تحقیق کو فقہ اسلامی کی روشنی میں ثابت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ اس کتاب میں علم کے نام پر تحریف اور اس کے بعد واقعات کو مسخ کرنے کا عمل اور اس کے بعد مذاق اور استہزار کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اور آخر کار بات اس پر ختم ہوئی ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی صورت انتہائی گھناونی اور بدترین ہے۔

جب نامور مستشرق کی نامور ترین کتاب کا یہ عالم ہے تو پھر علم، انصاف اور سچائی کا تقاضا یہ ہے کہ ان مستشرقین کے کارناموں کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے اور خالص علمی تنقید و تجزیہ کے ذریعہ ان کے طرز فکر اور انداز تحقیق کا محاسبہ کیا جائے، علم و عدل پر یہ احسان ہوگا کہ ان مستشرقین کی تدلیسات کا پردہ فاش ہو، اور ان کی کتابوں اور ان کے مراجع و مصادر میں ان کی غلطیوں اور تحریفوں کی نشان دہی کی جائے۔

مستشرقین کی کتابوں پر تنقید و تجزیہ کرتے وقت ان کے سماجی اور تاریخی پس منظر پر بھی توجہ دینا بہت ضروری ہے، مثلاً یہ کہ یورپ میں سماجی علوم کب رائج ہوئے، اور کب ان کو اسلامی معاشروں پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی، انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس، برطانیہ اور

ز فکری انقلاب رونما ہوا، اس کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ اس زمانہ
تا و امن، اقتصادی اور جغرافیائی دونوں طرح سے وسیع اور کشادہ ہوا، اور اس کے
جی علوم کے نئے نئے نظریات کا ظہور ہوا، یورپ کی یہ نئی کروٹ کوئی اتفاقی واقعہ
س کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا جب یورپ نے دوسرے براعظموں پر حملے شروع
، اور خالی اور غیر آباد علاقوں پر اس کا تسلط قائم ہونے لگا تھا اور ان بری دنیاؤں
روع ہو گیا تھا، اس کے بعد قبضہ و تسلط برقرار رکھنے اور نوآبادی قائم کرنے کے
ں آپس میں کشمکش شروع ہوئی اور اس طرح نوآبادیوں کی تقسیم ہوئی، ان میں نئی بستیاں
نگیں، اس عمل کے لیے گو محض اقتصادی اور عسکری قوت ہی کافی تھی تاہم یورپ نے
ا کہ وہ اپنے اس قبضہ اور تسلط اور سامراجی حرکت کو کسی اور رنگ و روغن سے بھی مزین
رے، ان کے فلسفۂ جمہوریت اور فلسفۂ حریت میں مفتوح قوموں کے لیے
یں تھی، اس لیے کہ سامراجی ارادوں کے ساتھ یہ فلسفے بے معنی تھے، اس حقیقت
ر انھوں نے دوسری راہوں سے مفتوح قوموں کو مرعوب کرنے کی کوششیں شروع
وششوں میں سے ایک کوشش فلسفۂ تہذیب یا سماجی علوم کے نئے اصولوں کی
اس وقت سے لے کر آج تک ذہنوں کو یہ باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے
ہیں اور ثقافتیں اور معاشرے اور مذاہب ایک دوسرے سے ممتاز ہیں،
تقار اور فنا کے مرحلوں سے گذرتے رہے ہیں، اور ان سب کے آخر میں نظریۂ
دوسری عالمگیر جنگ کے بعد گویا تہذیب کا قول فیصل ہے، اور یہ بات ثابت
نسانیت اپنے تاریخی ارتقاء کے مراحل میں مختلف تہذیبوں سے ہو کر گذرتی رہی
ب مغربی تہذیب انسانیت کے اس سفر کی منزل مقصود ہے، کیونکہ اس سے

پہلے کے معاشرے اور تہذیبیں ابتدائی اور ناقص حالت میں تھیں، جن میں جنگل کی زندگی قتل و غارت گری، قبائلی زندگی، جہالت، فقر، اور پس ماندگی وغیرہ جیسی غیر مطلوب اشیاء کا عمل دخل تھا، یورپ کے اس فلسفہ کے دو پہلو ہیں، ایک تو عملی دوسرا نظری، عملی پہلو سے یہ بات ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن اور ان کی تہذیب و ثقافت ہی نمایندہ ثقافت ہے، اور وہ نہ صرف یہ کہ اپنے ضمیر بلکہ پوری تاریخ کے سامنے دوسری پس ماندہ اقوام کے بارے میں جواب دہ ہیں، اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان قوموں کو اپنے قبضہ میں لے کر ان کو تہذیب کے معانی سے آگاہ کریں، اور اس کے بعد ان قوموں کو اقتصادی، اجتماعی اور تہذیبی بلندیوں سے ہم کنار کریں۔

یہی وہ فلسفہ ہے جس کو رڈیارڈ کپلن نے "سفید آدمی کا بوجھ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور اسی فلسفہ کو فرانسیسی اساتذہ اپنے شاگردوں کو استعمار کے نام گریجویشن کے درجات میں پڑھاتے تھے، اگر یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ ساری کاوشیں دراصل اپنے نفس کے اطمینان اور ضمیر کی راحت کا سامان تھیں، ساتھ ہی مقبوضہ قوموں کے لیے یہ ایسی پر فریب تھیں کہ یورپ کی فوجیں ان پر مسلط رہیں اور سرمایہ دارانہ کمپنی کے صاحب بہادر ان کا استحصال کرتے رہیں، اور ان محکوم قوموں کو یورپ کی اس زہرناکی کا احساس ہی نہ ہو۔

لیکن یورپ کی اس نام نہاد تہذیب کے علمبرداروں کی نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ اسلامی قومیں خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی، وہ اپنی قدیم وراثت تہذیبوں کا قابل فخر سرمایہ رکھتی ہیں، جو یورپ کی جدید تہذیب و ثقافت سے کسی طرح کم نہیں، یورپ کی نگاہیں اس سے بھی بے خبر ہیں کہ یہ تہذیبیں اپنے کردار اور اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فائق ہیں، بعض تہذیبوں کے ذکر سے کتابوں کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، بعض معاشروں نے حیرت ناک کارنامے

ں تہذیبیں اپنی معرفت کی منزل میں ہیں، اس لیے **صحیح** موقف یہ ہونا چاہیے
ونوں میں جو فرق ہوتا ہے اور جزئیات میں جو اختلاف ہوتا ہے علم تہذیب
ے ان کو واضح یا ایک دوسرے سے موازنہ اور بنیادی اور ضمنی دونوں
طالعہ باریک بینی سے کرتے، مگر اس کے بجائے ان تہذیبوں کا صرف
وازنہ کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغربی دانشوروں، محققوں اور تمدن کے
یان اور ان کے مقبوضہ ممالک کے معاشروں اور تہذیبوں کے درمیان اور
عام ہونے لگا۔

کا یہ ثمرہ تھا کہ اسلامی قومیں گو یورپ سے مغلوب ہوئیں اور فوجی لحاظ
چار ہوئیں، تاہم وہ ذہنی اور عقلی لحاظ سے یورپ کے سامنے سپر انداز
ں نے اپنے ماضی وحال کی تہذیب اور معاشرت سے رشتہ قائم رکھا، گو
در بھی ہوا لیکن مجموعی حیثیت سے اپنے تہذیبی ورثہ کی حفاظت کے
ربی تہذیب و طاقت کا مقابلہ کرنے میں مدد ملی، اور اب تو حقیقت
یا نہیں ہوا، مسلمانوں نے سر تسلیم خم نہیں کیا، اور مغرب و مشرق کے درمیان
تی اور فیصلہ کن چیز نہیں تھی، بلکہ یہ یورپ اور عالم اسلام کے درمیان قدیم
ب حصہ تھی۔

نے بھی اس حقیقت کو پالیا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام
اقت رکھتا ہے، اور سمندر پار کے ممالک میں جب تک اس کی جڑیں مضبوط
ب مغربی سامراج کو دوام نہیں حاصل ہو سکتا، اسی لیے ان مستشرقین نے
پنے سماجی علوم اور اس کے نظریات کو "اسلامی قوموں کے مطالعہ" کے

نام سے منتقل کریں اور اسلامی تہذیب کا جائزہ لیں، تاکہ اس کو ابتدائی تہذیبوں کی فہرست میں رکھا جا سکے۔

مستشرق رینی مونی نے "علم الاجتماع الجزائری" میں اپنے اس منصوبہ کو واضح کیا، انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی یہ کوشش اس تحقیق و مطالعہ سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہے جو ان سے پہلے کے مستشرقین مثلاً مستشرق صاباتیہ نے "علم الاجتماع الاہلی" کے عنوان کے تحت پیش کی ہے۔

ان ہی مستشرق رینی مونی نے اپنی مذکورہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "نظری اور عملی دونوں طرح کا مفاد اس میں ہے کہ ہم الجزائری قوم کے طرز بود و باش سے بخوبی واقف ہوں۔ نظری طور پر اس لیے کہ ہم فرانسیسیوں کا یہ فرض اور حق ہے کہ ہم ان تمام قوموں کے حالات سے واقف اور باخبر ہوں جن کی حفاظت ہمارا کام ہے، اور جن کے انتظام کی ذمہ داری ہم پر آتی ہے، ہمیں اس معاملہ میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے، فرانسیسی استعمار ہی نے سوشیالوجی کا علم پیش کیا، اور ہمارے مستشرق ریز لافیٹ اور چارل فیو نے امریکا میں علم الاجتماع کے مطالعاتی مراکز قائم کیے۔"

رینی مون یہ بھی لکھتے ہیں کہ "الجزائر میں ماسکرامی اور ڈوٹ نے عمدہ کارنامے انجام دیے، ہماری خواہش ہے کہ علم الاجتماع اور علم احوال الانسان کے مطالعہ کے لیے ویسے ہی ادارے قائم کیے جائیں جیسے یا امریکہ میں قائم ہیں، یا خود فرانس نے مغرب اقصیٰ میں جس طرح کے ادارے قائم کر رکھے ہیں، اس قسم کی تنظیموں کے قیام سے علمی فائدے اس طرح حاصل ہوتے ہیں کہ علم ہی قوت کے نفاذ اور حکومت کے رسوخ کا سرچشمہ ہے، علم ایک ایسا وسیلہ ہے جس پر عمل ناگزیر ہوتا ہے، ہم سے بہت سی غلطیاں اور جرائم صرف اس لیے سرزد ہوتے ہیں کہ ہم کو اپنے عائلی اور خاندانی خیر و بہبود کا علم نہیں ہوتا ہے، یہ علم اگر ہو تو بہت سی غلطیوں اور مجرمانہ

ں" (ص ۴۳)

ہ بعد یہ مستشرق الجزائر کی مسلم تہذیب اور قدیم تہذیبوں کے درمیان
اور اس کے فوراً بعد ہی یہ رائے صادر کرتے ہیں کہ الجزائر کے
ں بنیادی اختلاف ہے۔" (ص ۴۹) اسلامی عقیدہ کو وہ مقامی
رتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان معتقدات میں جنات اور ارواح
، اسی لیے وہ یعنی اسلام دین حقیقی کے مقابلہ میں ابتدائی دور
ر پرستی یا پھر ستارہ پرستی وغیرہ سے زیادہ قریب ہے، ریمی مون
ں سے مراد دین مسیحی ہی ہے، مستشرقین کے طرز تحریر کی یہ خاص
ہو یا تعلیم کا، بات اسلام سے بیزاری کے جذبات تک پہونچ
شتر گربگی اب علمی دنیا کے سامنے کوئی مخفی چیز نہیں ہے، مستشرق
ود اور دائروں کے تعین میں بے یقینی اور تذبذب کا شکار
ہے کہ الجزائر میں ایسی شے کا وجود تو ہے جسے (تہذیب) کا نام
یب کو قوسین میں لکھا ہے، مگر پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ قوسین میں
ملیتوں کے پاس ہے، یہ وہ قبائل ہیں جن کو قوم کا نام تو نہیں
ت رسوم و رواج اور اپنے مخصوص قوانین ضرور رکھتے ہیں، ان
، اور ان ہی سے مخصوص ہے۔ اس تہذیب کی وجہ سے اُن
اتی ہیں (ص ۵۰) مصنف کا یہ کنایہ ظاہر ہے کہ اسلام کی تہذیب
س دلچسپ تہذیب کو قدیم قبائلی تہذیبوں کے مماثل قرار
ر میں وہ دل کی بات اس طرح کہتے ہیں کہ" اس بحث کا حاصل

یہ ہے کہ اسلام اور بت پرستی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے، بلکہ اسلام بت پرستی کا تتمہ ہے" اس کے بعد وہ اس یقین کا اظہار کرتے ہیں "بحر متوسط ہمیشہ بحر یونان اور بحر لاطینی ہی رہے گا، اس لیے کہ نور اول اور فکر قدیم کے سوتے ابھی وہاں خشک نہیں ہوئے ہیں، اور یہ فرانس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان روشنیوں کو شمالی افریقہ میں قائم و دائم رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کرے۔" (ص ۵۳)

ریمی مونی کا یہ حرف آخر جسے انھوں نے نہایت معصومیت اور سادگی سے پیش کیا ہے، یہ اصلاً سارے مستشرقین کے مطالعہ اور تحقیق و تصنیف کا سچا اصول اور حقیقی طرز فکر ہے، اسلامی معاشروں اور تہذیبوں کے بارے میں یہ سب ہم آواز ہیں، ریمی مونی بار بار اپنے مسلک موضوعیت کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ وہ ڈورکایم کے نامور ترین شاگردوں میں سے ایک ہیں، ہم کو ان دونوں کے حسن نیت یا اصل نیت پر کوئی شک نہیں، لیکن استشراق کی حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے اور اسلام کے درمیان ایک فصل قائم رکھنا ضروری سمجھتا ہے، اس کے موضوع اور مطالعہ کی غرض و غایت کا اگر علم رہے تو پھر مطالعہ کے نتائج سے زیادہ حیرت نہیں ہوتی، خواہ یہ نتائج حقیقتوں کو کتنا ہی مسخ کر دینے والے اور تصویر کا غلط رخ پیش کرنے والے ہی کیوں نہ ہوں۔

ان مستشرقین کی نظر میں خود علم الاجتماع، علوم استعماری (SCIENCES COLONIALES) کے اہم ابواب میں سے ایک باب ہے، کیونکہ اس کا موضوع صرف یہ ہے کہ وہ ان تہذیبوں اور معاشروں کا جائزہ لے جن پر یورپ کی اقوام حاکم و قابض ہیں، اس کے مقاصد بھی لیل و نہار کی گردش سے متاثر نہیں ہوتے، پہلے مقصد یہ تھا کہ فرانسیسی شہنشاہیت کے مفاد کی خدمت کی جائے، آج یہ فرانسیسی جمہوریت کی خدمت کر رہا ہے، یہ کہنا برحق ہے کہ علم الاجتماع کا تعین

ے لیکن یہ محض ایک وسیلۂ استحصال ہے، جسے صرف ایسے مقاصد
ے جن کا تعلق نہ علم سے ہے نہ معرفت سے، اور نہ ہی مقبوضہ قوموں کے
ہے۔

مونی کی ایک کتاب کا جائزہ لیا ہے، مگر سچائی یہ ہے کہ اس پورے
مانوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کا جائزہ لیا جائے تو چند
ر سارے مستشرقین آخر میں وہی نتیجہ پیش کرتے ہیں جو ریني مونی نے
تنوع ہوتا ہے لیکن غرض وغایت میں سب ایک نقطۂ خیال پر متفق
م دشمنی ان کے تمام مطالعات و دراسات کے آخری نتیجہ اور
آتی ہے ۔

داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حقیقی معنی میں علم الاجتماع کے ماہرین
پر لکھنے والے زیادہ تر یا تو تنظیموں کے تنخواہ یاب ہیں، یا پھر فرانسیسی
ن کا وظیفہ یہی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اسلام کا انکشاف کریں اور
ر داد تحقیق دیں، ان لوگوں کی حیثیت دراصل معلومات، دستاویزات،
کو جمع کرنے والوں کی طرح ہے، یہ لوگ بدسلیقگی سے ان معلومات کو
یں، اور ان کو ایسے محققین کے تصرف میں خام مال کی حیثیت سے
ے رجوع نہیں کرتے، اور اندھے اعتماد پر اپنی تحریروں کو ان معلومات
ث و تحقیق کا یہ طریقہ ہمیں گرچہ عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے، لیکن
ت الانسان کے جاننے والوں کے یہاں اس وقت یہی طریقہ

ایک مستشرق ہنری لیوی برول (HENRY LAVY BRUHL) ہیں جو ابتدائی عقلیت کے نظریہ کو پیش کرنے والے کی حیثیت سے معروف ہیں، انھوں نے اس موضوع پر دس سے زیادہ کتابیں لکھیں اور سربون یونیورسٹی میں ایک تہائی صدی تک اسی موضوع پر درس دیا، لیکن حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے جن معاشروں پر داد تحقیق دی اور جن پر ان کو درجۂ اختصاص حاصل ہوا ان میں سے کسی ایک معاشرہ یا تہذیب کا انھوں نے خود جاکر کبھی مشاہدہ نہیں کیا، اس لیے کہ میدانی اور عملی تحقیقات مثالوں اور نظیروں کے پیش کرنے والی تحقیقات سے کہیں مختلف ہوتی ہیں، کبھی کبھی کوئی محقق یہ زحمت محض اتفاقی طور سے برداشت کرتا تھا، اس طرح پیرس کے یہ نامور مستشرقین کنج عزلت میں بیٹھ کر دور دراز کے ملکوں اور قوموں کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتے تھے اور داد تحقیق دیے تھے ۔

زیر بحث قوموں اور تہذیبوں کے علاقہ میں جاکر تحقیق کرنے والوں کو عینی شاہد کا درجہ حاصل ہے، مگر یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایسے محققین میں اکثر عربی زبان سے ناواقف تھے، ان کی معلومات کا دارومدار زیادہ تر ترجمانوں پر تھا، اس طرح براہ راست ان کا تعلق اور ربط اصل آبادی سے نہیں ہو پاتا تھا، ترجمانوں کو گرچہ مکمل طور پر غیر تعلیم یافتہ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان کی علمی صلاحیتیں بہرحال بہت محدود تھیں اور تحقیق کے رموز واسرار سے ناآشنا تھیں، ان مستشرقین میں ریني مونی کے علاوہ جن کی کتاب کا ہم نے اوپر ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے، چارلس لوکور (CHARLES LECOEUR) ماسکرای (MASQUERAY) برتھلون (BERTHOLON) گوتیٹ (E.F. GAUTIER) وغیرہ شامل ہیں؛ اس سلسلہ کی آخری کڑی جان ڈوڈینو (J. DOVIGNAU) ہیں، ان لوگوں نے علم الاجتماع کو بازیچۂ اطفال بنا دیا اور انھوں نے استشراق کو اتنا ہی نقصان پہنچایا جس قدر

ربی معاشروں کو۔

اس پر ذرا بھی حیرت نہیں کہ ان مستشرقین کے ورثہ کو ہم مختلف قسم کی کہانیوں ، بے سروپا واقعات سے بھرا ہوا پاتے ہیں، ان کو جس طرح کی معلومات فراہم ہوئیں یر کسی احتیاط و تفتیش کے ان سب کو اپنی تحریروں میں سمو دیا، انھوں نے ان ثانوی ی معلومات کے سلسلہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ واقعہ اور مفروضہ نے کے ذمہ دار بھی ہیں، البتہ ان کو ایسی تحریروں پر اپنے ان قارئین سے درج و اپنے قومی پندار، تفوق میں مبتلا تھے، تکبر اور تفوق کے اس احساس کو استشراق یادہ اہمیت دی، یورپ کو ایسی تحریروں کا انتظار رہا اور مستشرقین کی کتابوں سے ساس برتری کے لیے غذا فراہم ہوتی رہی ۔

لیں ایسی بھی ہیں جو حقائق حق کی صورت میں سامنے آئیں، مثلاً ایک مفکر (ALA) نے مستشرقین کے اس علمی نقص کو محسوس کیا، انھوں نے ان کی تحریروں مضمون لکھے، آلین علم الاجتماع کے ان ماہرین کا مذاق اڑاتے تھے، وہ کہتے تھے تحقیقی تنقید کے سادے اور عام اصولوں سے بھی ناآشنا ہیں، اور ان کی تحریریں ان کے کو واضح کرتی ہیں، انھوں نے ایک جگہ لکھا کہ "اگر میں اپنے قلم کو مخاطب کر کے یہ یرے پیارے قلم اور اس جملہ کو علم الاجتماع کے یہ ماہرین اگر اپنی تحقیق میں شامل جملہ کو روحانیات سے منسوب کر دیں گے اور یہ کہیں گے کہ میں نے اپنے قلم میں تا دیکھ لیا تھا۔"

ین جیسے مستشرقین کی تعداد بہت کم ہے، اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جو اپنے شتہ کو دجل و مکر اور فریب کے معائب سے قائم کہتے ہیں، درحقیقت

ستشراق کا میدان ان ہی کے لیے ہموار اور کشادہ ہے ۔

ان مستشرقین کی تحریروں میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ مثالوں اور واقعات کو پیش کرنے ہیں یہ لوگ اصل کی مطابقت کا لحاظ نہیں کرتے ہیں، اسلامی معاشرہ سے وہ ایسی بہت سی باتیں منسوب کر دیتے ہیں جن کا وجود ہی اس معاشرہ میں نہیں ہے، یہ مثالیں اور واقعات دوسری تہذیبوں سے لیے جاتے ہیں اور پھر ان کو اسلامی تہذیب کے نام سے پیش کر دیا جاتا ہے، ان لوگوں کے اصول اور ان کا زاویۂ نگاہ یورپ کے معاشروں کی روشنی میں اپنا ایک رخ متعین کرتا ہے، اور پھر وہ اسی روشنی میں دوسری تہذیبوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، اصول و مبادی کے لحاظ سے ان کا علم الاجتماع، مغربی معاشرہ اور تہذیب کے محور کے گرد ہی گردش کرتا ہے، ان ماہرین علم الاجتماع کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو، ہونا یہی چاہیے کہ علم الاجتماع کے اپنے اصول و قوانین اور آداب و شرائط ہوں، ان پر وقتی طور سے کسی تہذیب کے اثرات کا غلبہ نہیں ہونا چاہیے، مستشرقین کی اصولی غلطیوں کی نشان دہی کرتے وقت ان کی عجیب و غریب مثالیں ہمارے سامنے آئیں، مثلاً ہم نے ایسے محققین کو دیکھا جو اس راز سے واقف ہونے کے لیے بے چین ہیں کہ اسلامی معاشرہ اور ثقافت میں تھیٹر، ڈرامہ اور ناٹک کی ترقی کیوں نہیں ہوتی ؟ اسی طرح بعض ماہرین علم الاجتماع ایسے اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جن کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں سرمایہ داری فروغ نہیں پاتی ہے، ایسے محققین جب اپنی خواہش کے مطابق کوئی وجہ تلاش نہیں کر پاتے ہیں تو پھر وہ ایسی جزئی باتوں اور ایسی بے سروپا کہانیوں کی دریافت میں مصروف ہو جاتے ہیں جن کو وہ بحیثیت علت و سبب کے پیش کر سکیں، اور پھر وہ اپنے قلم کی ساری توانائیوں کو اس طرح صرف کرتے ہیں کہ گویا معاشروں اور ثقافت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی

ں تھیٹروں، ڈراموں اور ناٹکوں کا وجود نہ ہو، یا جب تک اسلامی
مالیت اور سرمایہ داری کے فیضان سے محروم رہیں گے، اس وقت تک
افت، کا پایۂ اعتبار ساقط رہے گا۔

مغربی تہذیب کا موازنہ دوسری تہذیبوں سے اس طرح کرتے ہیں کہ
ں ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کی تمیز ممکن ہے، ان میں سے اکثر مستشرقین
ں کے احساس میں اس طرح سرشار رہتے ہیں کہ ان کی نظر میں دنیا کا کوئی
نت مغربی تمدن کی ہمسری نہیں کر سکتا، یہ حضرات ہر غیر معاشرہ کو غیر منظم
ت کرنا ہی اپنی موضوعیت کا فرض اولین سمجھتے ہیں، دوسرے معاشروں
یب و تمدن کے نقائص اور عیوب اس طرح بیان کیے جاتے ہیں جس سے
انیت ہی مشکوک ہو جاتی ہے، ایسے موقعوں پر وہ اسلامی قوموں اور
ست نام لینے سے گریز کرتے ہیں، اور اسلامی قوموں کے بجائے وہ
مال کرتے ہیں، اسلامی اخلاقی قدروں کی جگہ وہ رسوم کے لفظ سے اپنے
ں، اور حد تو یہ ہے کہ وہ عقیدۂ اسلامی کو صحیح لفظ و معنی سے محروم کر کے
ے لفظ سے اپنے قاری کو مغالطہ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ف طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی تحریر و تحقیق کا محور صرف مغربی
دائرہ میں محدود ہے، جس میں ہر لمحہ ان کے احساس برتری اور
ں چشم پوشی کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، واقعات کی تصویر کشی میں کہیں بھی
ظاہر نہیں ہوتی، ان مستشرقین کی سرشت کو دیکھتے ہوئے شاید ان
یا شکوہ نہ ہوتا، مگر افسوس اس وقت ہوتا ہے جب یہ سب ایسے علمی حلقوں

کی جانب سے ظہور میں آتا ہے جو علم، موضوعیت، دقیقہ رسی، سنجیدگی پر ایمان رکھتے اور شک ویقین میں فرق کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہم اوپر بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس قسم کی فضول اور لایعنی تحریروں کا ایک انبار ہمارے سامنے ہے، ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کریں گے جس کو ہم نے اسی دور سے منتخب کیا ہے، فرانس کے ایک مشہور مستشرق ریمنڈ چارلس ہیں، ان کا علمی مرتبہ اس سے متعین کیا جا سکتا ہے کہ ان کو فرانس میں اسلامی شریعت کے اسرار کا سب سے بڑا ماہر اور فقہ کی باریکیوں کا سب سے بڑا واقف اور عربی تہذیب وثقافت سے سب سے زیادہ باخبر تصور کیا جاتا ہے، انھوں نے مسلسل تیس سال تک کتابیں لکھی ہیں، یونیورسٹیوں میں ان کے لکچر ہوتے رہے، انھوں نے جج کے فرائض بھی انجام دیے اور فرانسیسی حکومت کے مشیر بھی رہے۔ ان کی ایک کتاب "الروح الاسلامیۃ" علمی حلقوں میں بہت معروف ومتداول ہے۔

ہم نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ان ہی پامال اور روایتی مضامین وخیالات کا مجموعہ ہے، جن کا اظہار صدیوں سے وقتاً فوقتاً اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا جاتا رہا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے قالب کے لحاظ سے زیادہ خوش سلیقہ، جاذب نظر اور دل فریب ہے، انداز بیان دلکش ہے اور غیر جانبداری اور موضوعی ہونے کا مدعی بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانس کے ایک نامور اور قابل احترام پروفیسر لی۔ گویٹے نے اس کتاب کا شمار المکتبۃ الفلسفیۃ العالمیۃ (فلسفہ کے عالمی ذخیرۂ کتب) میں کیا ہے[1]، یہ وہ سنجیدہ ترین سلسلۂ کتب ہے جو نہایت جلیل القدر فلسفیوں، عالموں، مورخوں اور طب اور ریاضی کے ماہرین کی کتابوں کو شایع کرتا ہے۔

---

[1] عجیب بات یہ ہے کہ خود پروفیسر گویٹے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے معمولی معلومات بھی نہیں رکھتے ہیں۔

رجہ حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ ایسے مستشرق کی کتاب بھی عام استشراقی
الگ نہ ہو سکی، پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد ایسے
کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتے ہیں جو ریمنڈ چارلس نے اسلام پر لگائے
ہے دوسرے کا فقہی تعصب سے ہے، اور تیسرا قضا و قدر کے عقیدہ
تینوں باتوں کی تکرار کتاب میں اس طرح کی گئی ہے جس سے یہی باور ہوتا ہے
ہی تین چیزیں بنیادی ہیں اور مسلمانوں کی پوری معاشرتی زندگی اور
ان ہی تین چیزوں میں محدود ہے، مصنف کی نظر میں مسلمانوں کی معاشرتی
گی، فقہ کی تعلیمات اور ہدایتوں کی ایسی پابند ہے کہ اس سے مفر کی کوئی سبیل
دگی کی چھوٹی اور معمولی باتوں کو بھی اتنا جکڑ اور پابند کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی
دی کا امکان نہیں ہے، اپنی باتوں اور اپنے شعور اور اپنے خیالات کی
ہی کر سکتے ہیں جس کی اجازت ان کو فقہ سے حاصل ہے، فقہاء اور
ے نے اپنی تعلیمات کو معاشرہ کی عام زندگی میں اس طرح راسخ اور رائج کر دیا
معاشرہ ان کے بغیر حرکت ہی نہیں کر سکتا، فرد اور خاندان دونوں ہی
جکڑے ہیں، معاشرتی بود و باش ہو یا فکر و نظر کی بات ہو، اقتصادی
سیاسی تعلقات ہوں، فقہ کا عمل دخل ہر جگہ ہے، اسی لیے فقہ ایک
ی زندگی کے درمیان ایک رکاوٹ اور حجاب بن کر رہ گئی ہے، اور
غیر فطری ہو گئی ہے، اسی لیے چارلس اپنے مطالعہ کی روشنی میں کہتے ہیں
ب کرنے والی، حریت کی نفی کرنے والی اور بصیرت کو زائل کر دینے والی

چارلس کی نظر میں اسلام عملی لحاظ سے اپنے معاشرہ کو ہر قسم کی آزادی اور ارادہ و خواہش سے محروم رکھتا ہے، فقہی تعلیمات معاشرہ کو اپنے جال میں اس طرح لے لیتی ہیں کہ پھر ان سے ہٹ کر حرکت بھی نہیں کی جا سکتی ہے، مسلمان اپنی آزادی ہی نہیں انسانیت کو بھی کھو بیٹھتا ہے، اس کی حیثیت ایسے میکانکی آلہ کی سی ہوتی ہے جو صرف فقہاء کے اشاروں پر چلتا ہو، چارلس فقہ کی اس گرم بازاری کو بیان کر کے بالآخر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی تہذیب میں ترقی، ایجاد اور اختراع کی صلاحیتیں باقی نہیں رہتی ہیں کیونکہ ایک آزاد و خلاق فکر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ 'فقہ' ہے، وہ تمام ایسی امکانی کوششوں کو تباہ کر دیتی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ تبدیلیوں، ایجادوں اور انکشافوں کو قبول کرتا ہے۔

'الروح الاسلامیۃ' کا ایک مکمل باب چارلس نے فقہ کی نذر کیا ہے، ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مسلمان ایک قانونی (فقہی) مرد ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر فقہ کا مکمل جائزہ لیا جائے اور اس کے نمایاں اور بڑے مسلکوں کے علاوہ فروعی مکاتب فقہ مثلاً فقہ جعفری اور فقہ خارجی پر نظر ڈالی جائے تو یہ فقہ یورپ کی سائنس کی طرح دانشمند پر سخت گراں بار نظر آتی ہے، حالانکہ ہمارے علماء مستشرقین نے اس کی کثافت کو دور کرنے کی مسلسل کوششیں کی ہیں، لیکن چونکہ فقہ کا نظام قدیم اور بوسیدہ ہے اور پرانے طرز پر قائم ہے اس لیے یہ ہماری عقلیت سے بہت دور ہے، ہماری حیرت بلکہ دہشت اس لیے ہے کہ بغیر کسی فرق و امتیاز کے اور بغیر کسی حد فاصل کے حق اور شرع کے درمیان فقہ کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ (ص ۹۴ - ۱۹۳) اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اور فقہ کا رشتہ اسی وحی الٰہی سے قائم ہے،

بشری معیار اور تقاضوں کے مطابق قانون چاہتا ہے، توجب بشری
کے معیار پر پہونچا دیا جائے گا تو پھر حیرت و استعجاب کے سوا

ہی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل قانون قرار الٰہی ہے، خدا اور انسان
متضاد صورت پیش کرتا ہے، الٰہیات کو انسان کے اعمال و افکار
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کی تائید ہوتی ہے تو کسی کی مخالفت، اور
حکم ہی نہیں ہوتا، ایک چیز کو یہ قانون جائز قرار دیتا ہے تو دوسری کو
طۂ الٰہی اعمال کے نتائج اور واجبات کو بھی تقسیم کر دیتا ہے، حالت
ر موازنہ کے کچھ اصول وضع نہ کر لیے جائیں تو اس ضابطہ کو سمجھنا ہی

پنے ان خیالات کے اظہار کے بعد پھر یہ کہتے ہیں کہ فقہاء کے لیے
ا ممکن ہے کہ وہ حقیقت کی روشنی میں مسلمانوں کی معاشرتی اور
تقاضوں کو سمجھیں، کیونکہ وہ مسائل کے استنتاج اور استدلال
ر ہیں اور نصوص کو زمانہ کے تقاضوں سے مطلب نہیں ہے (ص ۱۹۲)
نڈ چارلس ان ہی خیالات کو بار بار دُہراتے ہیں، لکھتے ہیں کہ یہی وہ
نے اسلام کو یورپ کے فطری قانون کی برکتوں اور فائدوں سے محروم
ن کے بارہ میں آخرکار یہی کہنا پڑتا ہے کہ اسلام میں عدل و انصاف
شیت کا نام دیا جاتا ہے، اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ یورپ میں
لاق پر ہے، اور اسلام میں اس کی بنیاد شریعت کے اصول ہیں (ص ۱۹۴)

(باقی)

عربی زبان و ادب
میں
ہندوستانی علماء کا حصہ

از

عالی جناب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ، چنڈی گڑھ۔

"یہ وہ خطبہ افتتاحیہ ہے جو کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے موقع پر ۱۵ اپریل سنہ [illegible] کو دیا گیا تھا۔ "م"

مندوبین کرام و معزز خواتین و حضرات

آپ حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ہندوستانی جامعات و مدارس کے فاضل اساتذہ و علماء کی اس برگزیدہ محفل میں آپ نے مجھے چند افتتاحی کلمات کہنے کی عزت اور سعادت بخشی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کئی اعتبار سے ہندوستان کی ممتاز اور سربرآوردہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں بڑے نامی گرامی اساتذہ مسندِ درس پر رونق افروز رہے ہیں۔ جنھوں نے اپنے موضوعات کے میدان میں ایسے نقشِ قدم چھوڑے ہیں۔ جو آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی ہندوستان بھر میں اردو کے پہلے پروفیسر تھے، اور میرے صوبہ ہریانہ ہی سے اُن کا تعلق تھا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی ساری زندگی اردو زبان و ادب کے لئے وقف کر دی تھی اور آج وہ "بابائے اردو" کہلاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، میر ولی الدین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر ہارون خان شیروانی، ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی، یہ چند نام بے تکلف ذہن میں آگئے ہیں،

یسر محمد الیاس برنی بھی اسی جامعہ میں معاشیات کے پروفیسر تھے، مگر ان کی دلچسپی
تھا۔ وہ قرآنیات کے بھی ممتاز عالم تھے، مذاہب اسلامیہ پر بھی گہری
یات میں بھی کئی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کے مترجم و مصنف تھے، اور ان کا
غیر معمولی تھا۔ انھوں نے اردو شاعری کا موضوعات کے اعتبار سے
بارۂ جلدوں میں کیا تھا۔ جس کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا،
ں بھی یہاں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی جیسے
کی تصانیف آج بھی ہمارے لیے چراغِ راہ ہیں۔

آباد فرخندہ بنیاد کو دیکھیے تو اسے "مدینۃ العلوم" کہنا غلط نہ ہوگا۔ کون سا
ا اس سرزمین پر برگ و بار نہیں لایا۔ اور ہندوستان کی کون سی نمایاں
کی قدردانی حیدرآباد میں نہیں ہوئی۔ دینی مدارس میں یہاں صرف
ینا کافی ہے، جس کے بانی حضرت مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ
نھیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمۃ کے خلفاء میں ایک
ہے، کتب خانوں کی طرف نظر کیجیے تو یہاں گھر گھر میں علمی جواہرات کے
ے کتب خانوں میں سالار جنگ میوزیم لائبریری، کتب خانہ آصفیہ
ب خانۂ جامعۂ عثمانیہ ایسے علمی نوادر کے ذخیرے ہیں۔ جن سے بے نیاز
ی موضوع پر کوئی ریسرچ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ سب امتیازات
ۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی خدماتِ جلیلہ ایک طرف، اس
نوادر کو محفوظ کر کے ایک ایسا عظیم الشان کام کیا ہے کہ اس
ی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ یہاں سے شائع ہونے والا سہ ماہی مجلہ

"اسلامک کلچر" کل بھی اسلامیات اور علوم مشرقیہ کا سب سے زیادہ وقیع مجلہ تھا۔ اور آج بھی کوئی دوسرا مجلہ اس کے معیار کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ یہ وہ سرسری پس منظر ہے، جس کی روشنی میں وائس چانسلر صاحب کے دعوت نامہ کو میں نے دیکھا اور اسے اپنے لیے باعثِ فخر و مسرت سمجھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی جانب سے منعقد ہونے والے اس کل ہند سمینار کا افتتاح کروں جس میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علما اپنے فاضلانہ مقالات میں یہ جائزہ لیں گے کہ عربی زبان و ادبیات، اسلامیات اور متعلقہ موضوعات کے فروغ و ارتقا میں سرزمین ہند کے علماء کا کیا حصہ رہا ہے۔ یقیناً ایک اہم موضوع ہے اور اس کے ہر پہلو پر تفصیل اور جزرسی کے ساتھ غور ہونا چاہیے تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں کی قدر و قیمت کو پہچان سکیں اور انھیں بھی اس روایت کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی ترغیب ملے ورنہ کہیں یہ نوادرات آہستہ آہستہ یورپ اور امریکہ کی دانش گاہوں کی زینت نہ بن جائیں۔ اور اقبال کی طرح کوئی حساس قدرداں کہہ اٹھے۔ ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ یہ اک عارضی شے ہے
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے ہمیں چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی! روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

حضرات!

ہندوستان اور عرب دنیا کے تجارتی، تہذیبی اور علمی تعلقات بہت پرانے ہیں۔

اد تحقیق دی جا چکی ہے۔ میں اس تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ ع پر یقیناً مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ قدیم ثقافتی روابط پر علامہ سید سلیمان پنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں جو کچھ لکھ دیا ہے۔ اس پر ابھی تک ضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی آمد و رفت ہندوستان پر تھی۔ اور یہ تعلقات زیادہ تر تجارتی نوعیت کے تھے۔ پہلی اسلامی صدی کے ے قدم سندھ کی سرزمین تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستانی پنڈت خصوصاً طب، و نجوم کے ماہرین ہندوستان سے عرب دنیا میں جاتے تھے بہت سی ہندوستانی ں پہنچ گئی تھیں، اور ان کے عربی میں تراجم بھی ہو گئے تھے۔ اس حرکت کا نقطۂ فت کے اس اولین دور میں آیا جب برامکہ مسند وزارت پر فائز تھے، برمکیوں کے ید سلیمان ندوی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ وہ ہندوستانی الاصل تھے، اور ندی لفظ "پرمکھ" کی عربی شکل ہے، لیکن عربی و اسلامی علوم سے ہندوستان ن اور وسط ایشیا کی راہ سے قائم ہوا۔ اس وقت تک عرب دنیا میں قرآن ضوعات پر بہت کام ہو چکا تھا۔ حدیث کی جمع و ترتیب ہو چکی تھی۔ فقہی ل بن چکے تھے۔ اور چار بڑے فقہی مکاتب وجود میں آچکے تھے، یونانی فلسفہ م کے بعد ایک نیا توازن پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے علم العقائد اور علم الکلام ستہ ہموار کر دیا تھا۔ ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور طب میں بھی خاصی پیش رفت کا فن جمعِ روایات کے بعد عہد تدوین سے گذر کر حولیات (ANNALS) CHRONIC) تک پہنچ گیا تھا۔ یہ سب علمی سرمایہ ساتھ لیکر مسلمان علماء یشا، خراسان، ایران، عراق و حجاز سے ہندوستان آرہے تھے، یہاں کے

حکمرانوں کی مادری زبان ترکی تھی۔ مگر دفتری کاروبار فارسی میں ہوتا تھا۔ کیونکہ عباسی خلافت کے زمانے سے ایرانی دفتروں پر چھائے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے انتظامی معاملات سے نپٹنے کے لئے فارسی زبان کو خاصا مالدار بنا دیا تھا۔ لیکن حکمرانوں کا اور اس زمانے کے طبقۂ اشراف کا اور عوام کا مذہب اسلام تھا۔ اس لئے تمام مذہبی امور میں عربی کی بالادستی ہر زمانے میں برقرار رہی، عوام کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے صوفیاء نے ان ہی کی زبان میں تلقین کا راستہ کھول کر ابلاغ کے خلا (COMMUNICATION GAP) کو پر کر دیا تھا۔ اس لئے مقامی زبانیں اور بولیاں بھی مالدار ہوتی رہیں۔ غرض یہ کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ میں ہم اس طرح کے لسانی مسئلوں سے دوچار نہیں ہوتے جیسے آج کی مہذب دنیا کے سامنے آرہے ہیں۔

عربی علوم کا پہلا مرکز ملتان میں قائم ہوا۔ ٹھٹھہ اور دیبل میں بھی ابتدائی علمی سرگرمیوں کے سراغ ملتے ہیں۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں لاہور مرکز بن گیا تھا۔ اور جب غوری سلاطین نے دہلی اور آس پاس کے علاقوں کو فتح کر لیا تو دہلی کو بھی علمی حیثیت سے وہی مقام حاصل ہو گیا۔ جو بغداد یا مصر یا بخارا یا سمرقند کو حاصل تھا۔ یہاں علم کا ایسا چرچا تھا کہ خراسان، ایران، ترکی، عراق، یمن اور حجاز سے علماء یہاں کھنچے چلے آتے تھے، اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے، جیسے گجرات میں بدر دمامینی، خطیب گازرونی۔ اور عماد طارمی کے نام ملتے ہیں۔ جو شیراز و حجاز و یمن سے ہجرت کر کے آئے تھے، قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے کہ عہد تغلق میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے، لیکن علم کی رفتار ترقی بھی سیاسی انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ تاتاریوں کے فتنے نے بغداد اور اور وسط ایشیا کے علماء کو ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اور یہ فتنہ ہندوستان کی علمی و تہذیبی زندگی کے حق میں ایک نعمت بن گیا تھا۔ مگر یہاں بھی کسی ایک علاقے میں زیادہ

امن و استحکام نہیں رہ سکا۔ پہلی بڑی ہجرت تو اس وقت ہوئی جب ۷۲۷ھ
میں محمد بن تغلق نے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسایا اور ہندوستان کے مرکزی
ے بہت سے علماء، صوفیہ، فن کار اور صناع دکن کی طرف آگئے۔ انھوں نے یہاں کی
میں ایک نئی حرکت اور چہل پہل شروع کر دی۔ مگر یہ بھی ایک اور انتشار کا پیش خیمہ
دار الخلافہ پھر دہلی کو منتقل ہوا اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں علمی کاموں کے لیے جو سکون
کار ہے، وہ غارت ہو گیا۔ نویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں تیمور نے ہندوستان پر
یک بار پھر یہاں کی بساط الٹ گئی۔ اور علماء و صوفیہ نقل مکان پر مجبور ہو گئے۔
ار میں حضرت گیسو دراز نے دہلی سے پہلے گجرات اور بہمنی سلطنت کے دار الخلافہ
خ کیا تھا۔ ادھر گجرات میں مظفر شاہ نے ایک مضبوط حکومت قائم کر لی تھی
غیر یقینی حالات کے مقابلہ میں بہت پر امن تھی، شاہان گجرات کی یہ حکومت
چوراسی سال تک قائم رہی اور اس مدت میں یہاں علوم مشرقیہ کو جو فروغ
ا وہ اتنی کم مدت میں ہندوستان کے اور کسی خطہ میں میسر نہیں آیا۔ یہاں دکن
عادل شاہی، برید شاہی، احمد شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں نے عربی، فارسی
ت اور خود ملکی زبان و ادب کی جو سرپرستی کی ہے، اس کی ایک طویل تاریخ ہے
ط اس مختصر وقت میں نہیں کیا جا سکتا۔ اتر پردیش کے مشرقی علاقے میں شاہان
علوم مشرقیہ کی سرپرستی کی۔ قاضی شہاب دولت آبادی اور قاضی عبد المقتدر دہلوی
لانا ابو الفتح اور مولانا احمد بن محمد تھانیسری جیسے کتنے ہی نمایاں نام ہمیں
تاریخ میں ملتے ہیں۔ جن کی بدولت جونپور کو "شیراز ہند" کہا جاتا تھا۔ جس طرح گجرات
عاعیں دکن اور مالوہ میں پھیلیں۔ اسی طرح جونپور سے یہ انوار لکھنؤ کو منتقل ہوئے جہاں

سلطنت مغلیہ کے آخری زمانہ میں مولانا نظام الدین سہالوی نے معقولات کا وہ مدرسہ قائم کیا جسے فرنگی محل کہا جاتا ہے۔ اور ان مدارس میں پڑھانے کے لیے ایک ایسا جامع نصاب تیار کیا جو آج بھی ان کے نام سے منسوب ہو کر درس نظامی کہلاتا ہے ہمارے علماء نے اس کو بھی جامد بنا دیا۔ اگر وقت اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہ کر وہ اس نصاب پر نظر ثانی کرتے رہتے تو یہ ہماری اس زمانہ کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا۔ اور اس عہد کے چیلنجوں کا جواب بھی دے سکتا تھا۔ کسی حد تک ندوۃ العلماء نے اس نصاب میں کچھ رد و بدل کیا ہے، ورنہ روایتی مدارس میں آج بھی بطلیموس کا نظام ہیئت پڑھایا جاتا ہے۔ اور منطق کی اُن کتابوں کا درس دیا جاتا ہے۔ جن کی حیثیت اب محض آثار قدیمہ کی رہ گئی ہے۔

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی کیا خدمت ہوئی ہے۔ اس کا اگر عہد بہ عہد جائزہ لیا جائے تو ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ ع سفینہ چاہیے۔ اس بحر بیکراں کے لیے غزنوی، غوری، غلامان، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل خاندان کے حکمرانوں سے لے کر آج آزاد ہندوستان کے سیکولر نظام زندگی تک ہر دور اور ہر علاقہ میں اس کی تاریخ تلاش کی جا سکتی ہے۔ وقت کی ضرورت اور رجحانات کے اعتبار سے یہ فرق ضرور ہوگا کہ کہیں کسی موضوع پر زور ہوگا، کہیں کسی پر، لیکن اس روایت کے تسلسل میں فرق نہیں آیا ہے۔ آخر عہد مغلیہ میں ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے قصبات میں علوم و ثقافت کے مرکز قائم ہو گئے تھے، اور یہاں بیٹھ کر علماء، خاموشی اور بے لوثی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے تھے، ان مراکز کی سرسری فہرست بھی خاصی طویل ہوگی۔ اور اس میں امروہہ، بلگرام، ہرگام، جائس، نیوتنی، گوپامئو، امیٹھی، سندیلہ، کاکوری، خیرآباد، ٹونک، رام پور،

یا پور، گلبرگہ، بُرہان پور، اورنگ آباد، مرشد آباد، لکھنوتی اور
جنوں تمام سامنے آئیں گے جن میں سے ہر علاقے کی مستقل تاریخ

بین اور اساتذۂ کرام!

ن میں علوم عربیہ کے مراکز کا ایک بہت ہی سرسری خاکہ ہے۔
۔ ان مرکزوں میں کن موضوعات پر کیا کام ہوئے ہیں۔ اسلامی دنیا میں
یں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی منقولات اور معقولات۔ کچھ علوم ایسے ہیں
ں کو منتقل ہوئے۔ ان میں تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ و سیرت
ر دوسری شق کے علوم فکرِ انسانی کے زائیدہ ہیں۔ جنھیں عقل اور منطق
مدوّن کیا گیا ہے۔ ان میں فلسفہ، منطق، طب، ریاضی وغیرہ آتے ہیں۔
شاخوں میں منقول و معقول دونوں ایک خاص تناسب سے
وستانی علماء نے ان کی ہر شاخ میں اپنی ذہانتوں کے جوہر دکھائے
ن کی لغت اور صرف و نحو پر بھی کام ہوا ہے۔ لغت میں رضی الدین
ت ضخیم کتاب "العُبَاب الزّاخر" بیس جلدوں میں صرف ب
تک پہنچی تھی۔ یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو
سے کم میں نہ سماتی۔ یہ ساتویں صدی ہجری میں مرتب ہوئی۔ اور
اسے تمام اہم لغات کا ماخذ بنی رہی ہے۔ اب اس کو جدید ترتیب
ن چھاپا جا رہا ہے۔ رضی الدین صغانی ہندوستانی تھے، اور بقول
م الدین اولیاء بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں سے حجاز، یمن،

عراق وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے علمی حلقوں میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ حتیٰ کہ خلیفۂ بغداد کی جانب سے سفیر بنا کر سلطنت دہلی کے دربار میں بھیجے گئے۔ ان کی تصانیف دو درجن سے بھی زیادہ ہیں۔ جن میں سے ابھی دو چار ہی چھپی ہیں۔ ان کا ایک زندۂ جاوید کارنامہ حدیثِ نبویؐ کا مجموعہ "مشارق الانوار" ہے۔ جو صدیوں تک ہمارے مدارس میں پڑھائی گئی ہے۔ اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔

حدیث کی دوسری اہم کتاب جو ہندوستان میں تصنیف ہوئی "کنز العمّال" ہے جس کے مرتب شیخ علاء الدین علی متقی برہان پوری ہیں یہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔ فن حدیث میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ دہلوی، نواب صدیق حسن خاں، حضرت عبداللہ شاہ نقشبندی اور ہمارے زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، یہ چند نام بغیر کسی اہتمام کے لکھے ہیں۔ ان کی خدمات کسی طرح علمائے خطۂ عرب سے کم نہیں ہیں۔

لغت میں ایک اور کارنامہ "تاج العروس شرح قاموس" حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد اور قصبۂ بلگرام کے باشندے سید مرتضیٰ بلگرامی کا ہے۔ انھیں عام طور سے مرتضیٰ زبیدی کہا جاتا ہے۔ اور عرب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبید یمن کے رہنے والے تھے، مگر فی الواقع وہ ہندوستانی تھے۔ یہاں سے ہجرت کر کے یمن اور پھر حجاز گئے۔ وہاں سے مصر پہنچے اور وہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔ وہیں انتقال کیا۔ ان کی بہت سی کتابیں چھپی ہیں، اور بہت سی ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ اس کے ایک باشندے کو زبان و لغت کے معاملہ میں عرب دنیا میں بھی سند مانا جاتا ہے۔ ہندی علماء کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ "کشاف اصطلاحات الفنون" ہے، اس میں مختلف علوم کی

ی ہے۔ اور یہ علماء کے لیے ایک بہترین حوالے کی کتاب ہے اس کا
ضی محمد اعلیٰ تھانوی ہے۔ جس کا مزار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے۔
ہندی علماء نے بہت سی کلاسیکی کتابوں کی شرحیں لکھی ہیں۔ اور
ں مرتب ہوئی ہیں جن میں سے ایک قدیم مجموعہ فتاویٰ "تاتارخانیہ"
ہند کے تعاون سے شائع ہوا ہے، اسے قاضی سجاد حسین صاحب
موضوع تصوف و سلوک ہے۔ اس میں بھی متعدد کتابیں
رف حضرت گیسو درازؒ کی "شرح عوارف" کا ذکر کروں گا جس کا
نہ میں ہے۔ اور جسے غالباً عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی ہی میں
۔

منقول کی طرف ہلکے سے اشارے تھے، ظاہر ہے کہ ان کی تفسیر
لانہ مقالات آپ آنے والے چار دنوں میں سنیں گے۔ کاش!
ں میں شریک ہو کر اپنی علمی تشنگی کو فرو کرنے کا موقع پا سکتا، لیکن
دہ ادب کا بھی ہو جائے۔ عربی میں شعر کہنے والے یہاں ہر دور میں
بی میں شعر موزوں کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلیؒ کے خلیفہ
قصیدۂ لامیہ" ایک معروف قصیدہ ہے۔ لیکن علامہ غلام علی
یی ہے کہ ان کے عربی میں ایک چھوڑ سات دیوان ہیں جنھیں
ں دواوین کا صرف انتخاب ہی چھپا ہے۔ ان کے سوا ہندوستان
ب دیوان شاعر نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری

کا نام لے سکتے ہیں۔ مگر ان کا شعری مجموعہ بھی دیوان کے طور پر مرتب نہیں ہوا ہے علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کا ایک اور حیرت انگیز کارنامہ "شفاء العلیل" ہے جس کا قلمی نسخہ یہیں حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ابو الطیب المتنبی عربی کا کتنا عظیم شاعر ہے، اس کے کلام پر بعض متقدمین نے نحو اور قواعد کی پابندیوں سے انحراف کرنے کا الزام لگایا ہے، آزاد بلگرامی نے عملاً اس کے ایسے سقیم اشعار پر اصلاح کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اگر المتنبی اس شعر کو یوں کہتا تو غلطی سے محفوظ رہتا۔ ایک ہندوستانی کی یہ جرات رندانہ قابل داد ہے۔ اور تقریباً سب مواقع پر آزاد بلگرامی کی رائے قرین انصاف ہے۔ یہ قیمتی مخطوطہ حال ہی میں ہمارے دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی نے حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ اور اسے عربی مجلہ "ثقافۃ الہند" میں چھاپا ہے۔ جس کے وہ ایڈیٹر بھی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کی خدمات جلیلہ کا تذکرہ نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ یہ دونوں بزرگ عربی کے شاعر بھی تھے، مگر ان کی خدمات کا دائرہ عملاً ایسا وسیع ہوا ہے کہ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے عربی دینی مدارس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح اسی خانوادہ سے جا کر متصل ہوتا ہے۔

عہد حاضر میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب قبلہ کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان کا اسلامی دنیا میں ایک ممتاز اور اعلیٰ مقام ہے، اسی سلسلہ میں یہاں مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی کا بھی تذکرہ کر دوں گا۔ جو صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، اور جنھوں نے عربی نظم و نثر میں یکساں قدرت کے ساتھ لکھا ہے۔ عربی علوم پر کرناٹک، اراکاٹ، کیرلا، آندھرا اور مہاراشٹر سبھی علاقوں میں بہت دقیع کام ہوا ہے۔ اراکاٹ کی حد تک تو پروفیسر محمد یوسف کوکن صاحب نے انگریزی میں ایک مبسوط کتاب لکھ کر بہت سے کاموں کا احاطہ کر لیا ہے۔

ضرورت ہے، کہ ہر علاقہ میں ہونے والے کاموں کا، تفصیلی تنقیدی
ابھی تو کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں موجود عربی مخطوطات کی ہی
ست نہیں بن سکی ہے۔

ت !

ہند نے عربی اور فارسی کو کلاسیکی زبانوں کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اور ان
ے حکومت کو دلچسپی ہے۔ ہمارے ملک کی تقریباً بیس جامعات میں عربی کا
کالجوں کی تعداد تو یقیناً کئی درجن ہوگی۔ پھر اس ملک میں ندوۃ العلماء لکھنؤ،
، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ نظامیہ حیدر آباد اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر
مدارس بھی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ایک
خبار و مجلات عربی میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں عربی مجلہ "ثقافۃ الہند"
ے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کی ادارت
سال قبل شروع کرایا تھا۔ یہ ہندوستانی سفارت خانوں کے ذریعہ تمام
تا ہے۔ اور آج کل اس کو پروفیسر نثار احمد فاروقی ایڈٹ کر رہے ہیں۔
ے دن میں اور رات کو دو بار نشریات ہوتی ہیں۔ جن کا وقت حال ہی میں
، ریڈیو پر عربی کا پورا یونٹ قائم ہے، وزارت تعلیم عربی مدارس کو معقول
ہے۔ اور مدارس میں رہ کر جو اساتذہ یا طلبہ کسی عربی مخطوطہ کو ایڈٹ
ی خاص موضوع پر ریسرچ کرنا چاہیں۔ انھیں تین سو روپیہ ماہوار
سال تک کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس سے مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کو
ہے۔ عربی اور فارسی کے دو دو ممتاز عالموں کو حکومت ہر سال

سند امتیاز دیتی ہے، جو صدر جمہوریہ اپنے مبارک ہاتھوں سے عنایت فرماتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سال یہ سند امتیاز پانے والوں میں اسی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر مولانا عبد الستار خان صاحب بھی ہیں۔ اس کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبۂ عربی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

حضرات !

اس سمینار کا موضوع اتنا وسیع ہے۔ اور وقت اتنا محدود، میرا دائرۂ علم اس سے بھی زیادہ تنگ۔ حق ادا ہو تو کیسے؟ بہر حال مجھے رسم افتتاح ادا کرنے کے لیے رسمی طور پر کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے، کہ بقول شاعر۔ ؎

جنوں کی منزلیں اتنی کٹھن، ہیں مبتدی ایسا
کہ اب تک ہاتھ رکھنا بھی نہیں آتا گریباں پر

آپ حضرات کے درمیان یہ وقت گذار کر مجھے دلی مسرت ہوئی ہے۔ میں شعبۂ عربی کو اس کامیاب علمی اجتماع کے لیے مبارک باد دیتے ہوئے اس کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں۔

دروس الادب حصہ اوّل و دوم

دروس الادب کے نام سے عربی ابتدائی طالب علموں کے لیے عربی کی ریڈریں، جو اس طرح مرتب کی گئی ہیں، کہ طالب علم کو عربی لکھنے اور بولنے کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے، جو درحقیقت عربی پڑھنے کا اصل مقصد ہے، یہ عربی کے اکثر مدارس کے نصاب میں شروع سے شامل ہیں۔

مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم۔ قیمت علی الترتیب۔ ۳ و ۵ روپیہ۔
(منیجر)

ابلیس وبشر اور اقبال

از

اکٹر محمد منصور عالم شعبۂ اردو و فارسی. مگدھ یونیورسٹی

فا دد آدم حاصل است   جلوۂ او آشکار از پردۂ آب وگل است
(زبورعجم - حصہ دوم)

ئے کہ اقبال کی شاعری کا بنیادی محرک ابلیس ہے، توتعجب کرنے کی ضرورت
ا تو اقبال کو بازیابی بشر کی فکر نہ ہوتی۔ اور خودی، عشق، حرکت وعمل، مسئلہ
تیار، وصل وفراق، عقل وعشق وغیرہ کے اسرار ورموز بھی فاش نہ ہوتے۔
ی ابلیس کے توسل سے بشر کی تلاش ہے۔

ی تعالے ہے:۔

لْمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ	اور وہ ہے جس نے کیا تمکو جانشین زمین کا
قَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ	اور بلند کیا بعض تمہارے کو اوپر بعض کے درجے میں۔
یْ مَآ اٰتٰکُمْ (الانعام ۱۶۶)	تاکہ آزماوے تم کو بیچ اس چیز کے کہ دیا ہے تم کو[۱]

یمان وعمل صالح اور حق وصبر کے ساتھ زندگی گذارنے سے بلند ہوتا ہے۔
ہے کہ وہ آئندہ بھی خلیفہ بنا رہے گا۔

ی آیتوں کا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجمۂ قرآن سے منقول ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ	وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں تم میں سے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ	اور کام کئے اچھے البتہ خلیفہ کرے گا ان کو بیچ زمین کے
کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ	جیسا کہ خلیفہ کیا تھا ان لوگوں کو کہ پہلے ان سے
(النور۔ آیت۔ ۵۵)	تھے۔

اس دنیا میں انسان کا یہی منتہائے عروج ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ اور الناس کا امام وپیشوا بن جائے۔ پھر اسے کسی امر کا خوف وغم نہیں۔ ورنہ انسان تو خسارے میں ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ابلیس کے نرغے میں ہے۔ خواہ اس کا تعلق جس قوم وملت سے بھی ہو۔

انسان کا خلیفۃ الارض بنایا جانا خلافِ رضائے انسان نہیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی	تحقیق روبرو کیا تھا ہم نے امانت کو
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	اوپر آسمانوں کے اور زمین کے اور
فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَ	پہاڑوں کے، پس انکار کیا سب نے یہ کہ
اَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا	اٹھاویں اس کو اور ڈر گئے اس سے
اِنْسَانُ ط (الاحزاب۔ ۷۲)	اور اٹھا لیا انسان نے۔

”یہ امانت“ احکام خداوندی کی بجاآوری اور اوامر ونواہی کے نفاذ کی ذمہ داری یعنی نیابت الٰہی تھی۔ اسے زمین وآسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھا گیا۔ مگر انھوں نے اپنے اندر تابِ قبولیت نہ پائی۔ انسان نے یہ حوصلہ دکھایا کہ اس بوجھ کو اٹھا لیا، حافظ شیرازیؒ کہتے ہیں:۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

سوال قرعہ اندازی کا نہیں ہے۔ یہ تو ایک شاعرانہ انداز بیان ہے حقیقت

سان نے اس بار امانت کو دیدہ و دانستہ اور برضا و رغبت اٹھایا ہے۔
کا صلہ بھی ملا۔ وہ اشرف المخلوقات ثابت ہوگیا۔ یہ ارض و بحر و جبال
ت و ثابت و سیار اس کے مسخر کر دیئے گیے۔ امامتِ عالم کی اہلیت اسے عطا
اور صرف اسے ہی عطا کی گئی۔ مبارکباد! یہ کیسا اچھا اور عظیم الشان
اعزاز کے باعث فرشتے۔ مخلوق معصوم و مقربین خدا۔ بھی اس کی جنبشِ
ر بنے لگے۔

یا ہوگیا کہ خلیفہ کی آنکھوں میں مجبوری اور یاس دکھنے لگی۔ ؟ خلیفہ اور مجبور؟
سکتا ہے۔ اس کے لباس جسم پر پیوند ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ اپنے پیراہنِ فکر میں
ری کے پیوند نہیں لگا سکتا۔ ایسا کب ہو سکتا ہے۔ جب انسان اپنی ذمہ داریاں
۔ اور بے حسی اور بے عملی اختیار کرلے۔ سو، ایسا ہی ہوگیا۔ اور ہوا تو انسان نے
پنا حال بھی دیکھ لیا۔ اس کے مزاج میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ وہ اپنے
ترین مقام سے گرنے لگا، گرتا گیا۔ اتنا گر گیا کہ مزید پستی کا تصور ممکن نہیں۔

كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (الاحزاب۔۷۲) تحقیق وہ تھا بے باک نادان۔

ذمہ داری قبول کرنا ظلم اور جہالت کی بات نہیں۔ مگر نااہلوں کے لیے،
ں تو نہیں تھا۔ ہاں اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کرکے اس نے نااہلی کا
انسان جب اپنے فرائض بھول جاتا ہے۔ بھول چوک نہیں۔ دانستہ
ہے۔ اور احساس جواب دہی سے بے نیاز و بے پروا ہو جاتا ہے۔ تو لازمی
ں طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ پستی جہل کی علامت اور ظلم کی بنا ہوتی ہے۔
ت میں انجام انسان صیدِ ابلیس ہوتا ہے۔ اور یہ انجام ہماری نگاہوں کے

سامنے ہے، انسان، جسے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونا تھا، کتنی آسانی سے ابلیس کی زد میں آگیا!

اس سانحے کا اقبال پر گہرا اثر ہے۔ وہ انسانوں کو ابلیسی نظام سے آگاہ کرتے ہیں نہایت خلوص و ہمدردی سے اس نظام کا توڑ بھی بتاتے ہیں۔ اور انسانوں کو از سرِ نو اس بلند ترین مقام پر جو ان کی آفرینش کا مدعا ہے، فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارے اردگرد، ہر طرف، ابلیسی نظام مستحکم تر نظر آتا ہے۔ سیاست ہے تو دین سے الگ ہو کر اشتراکیت و سامراجیت کی کشمکش ہے۔ معاشرت کیا ہے، نسلی امتیاز اور روایات و خرافات کی جلوہ گاہ ہے۔ مذہب کی ضرورت کیا ہے۔ اخلاق کے خود ساختہ ضابطے کافی ہیں۔ جو کچھ ہے دنیا کی زندگی ہے۔ اسے متاع الغرور سمجھ کر ذلیل و خوار نہ کیا جائے۔ شرفِ انسانی آرام طلبی، عیش کوشی اور بیگانۂ یوم فردا رہنے کے سوا اور کیا ہے۔ خودی اور غیرت بھلا کیا شئے ہے عشق کو حوصلہ درکار نہیں۔ بوالہوسی کی ہمت جوان ہو! عمل کو توفیقِ خرام کس واسطے؟ کہ انسان مختار کہاں؟ وہ تو مجبور محض ہے!

یہ اور اسی طرح کے حالات و خیالات میں آج کا انسان گھرا ہوا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ہماری سمت فکر بدل گئی ہے۔ صحیح ڈھنگ سے عمل کرنا اسی وقت ممکن ہے۔ جب صحیح ڈھنگ سے سوچنا نصیب ہو۔ جب ہماری فکر ہی دو نمبر کی ہوگئی ہے۔ تو اعمال کیوں نہ متاثر ہوں گے۔ حالانکہ سوچنے والوں کے لیے ایسی صورت حال میں چوکنا اور ہوشیار ہونے کے واضح اشارے موجود ہیں۔ چشمۂ آفتاب روز ابلتا ہے۔ روز ہی "خون" کی ندیاں رواں ہوتی ہیں۔ ہر رات مظلوموں کے آنسوؤں سے بھیگتی ہے۔ اور ہم ہر لحظہ شکستِ انسانیت کے مناظر دیکھتے ہیں۔ کیا یہ صورت حال نہیں؟ اور اسے بدلنے کی سعی کرنا ہمارا فرض نہیں۔ ؟ ۔ اقبال کی شاعری ہمیں اسی تقاضے کی طرف متوجہ

یا اس عظیم ترین اور بے نظیر انسانی وجود کو "بشر" کہہ رہا ہوں۔ مگر اس معنی میں قطعی نہیں جس معنی میں ہم ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک میری یادداشت فی الحال کام کر رہی ہے قرآن مجید میں انبیائے کرام کے لیے بطور معرفہ "انسان" کا لفظ نہیں آیا۔ ہاں، رجال یا رجل کے الفاظ آئے ہیں۔ اور بشر، بیشتر مقامات پر مستعمل ہوا ہے، اور غیر انبیا، بالخصوص عام انسانوں کے لیے نیز۔ جہاں انسانی کمزوریوں کا ذکر مقصود ہے۔ وہاں لفظ "انسان" ہی استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے میرے نزدیک "انسان" اور "بشر" میں معنوی فرقِ مراتب ہے۔ "وہ ہماری ہی طرح بشر ہے" یا "ہم اس کی طرح بشر ہیں" کی حقیقت یہ ہے کہ انسانی صفات ہمارے اور اس کے درمیان قدرے مشترک ہیں، لیکن ہم اتنے کمزور واقع ہوئے ہیں۔ کہ ان صفات کو بہ معیار اعلیٰ برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر وہ مضبوطی آجائے۔ جس سے وہ صفات بشر کو اپنا کر ان پر قائم ہو جائے۔ یہ "شاہین"، "لالہ"، "قلندر"، "فقیر"، "درویش"، "مردِ حر"، "مومن"، "مسلم"، "مسلمان"، "مردِ سپاہی" وغیرہ جیسے الفاظ کے ذریعے جو خیالات انھوں نے پیش کیے ہیں، وہ واقعتاً صفاتِ محمدیؐ کی تجدید کے لیے ہیں۔

در جہاں زی چو رسولِ انس و جان تا چو او باشی قبولِ انس و جان
(حلاج۔ جاوید نامہ)

گرچہ یہ الفاظ "بشر" کے متبادل نہیں کیے جا سکتے۔ مگر اقبال کے ہاں یہ محض لغوی مفہوم رکھنے والے الفاظ نہیں رہے، اصطلاح بن گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جانے پہچانے پرانے الفاظ نئے مفاہیم ہیں۔ "بشریت" کی علامت ہیں۔ ان سے اقبال کے تصورِ بشر کی وضاحت ہوتی ہے۔ گو لفظ "بشر" بھی کم استعمال ہوا ہے۔ انسان کی معراج و تکمیل یہ ہے کہ وہ بشریت کا حامل ہو جائے۔ اس کو یوں بھی کہیے کہ وہ مزاجِ

سانیت کی معراج اور بالادستی چاہتے ہیں۔ انسانیت نشوونما کیسے پا سکتی
ہلک حالات کیونکر ختم ہو سکتے ہیں۔ یہی مرکزِ فکر ہے یا الفاظ بدل کر
کی ترتیب و ترقی کن خطوط پر ممکن ہے اور ہمارے سامنے اس کا مثالی
ا ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں۔ کہ وہ "الاسلام" کا پابند "مومن" ہوگا۔ اور اپنے اندر
رکھے گا۔ "بشر"؟ ۔ ہاں! اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں
سان۔ مومن، مسلم، مسلمان جیسے لفظوں کے سہارے مخلوقِ اعظم کی
عتوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ وہ دراصل "بشر" کی ہی صفات
امر کی وضاحت ضروری ہے۔ عبدالکریم الجیلی نے "الانسان الکامل"
ل کی تھی۔ مداحینِ اقبال نے (ان میں یہ ناچیز بھی ہے۔) اسی کی روشنی
اعری میں "انسان کامل" کے تصور کا عکس دیکھا۔ کیونکہ خود اقبال نے
ب فیض کیا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ اقبال نے بجنسہٖ یہ ترکیب کہیں
البتہ "مردِ مومن" "مردِ مسلمان" "مردِ پختہ تر" "مردِ عارف" "مردِ محرم" وغیرہ مرکبات
ستعمال کیے ہیں ع نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ع گماں
مردِ مسلماں کا وغیرہ۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان مرکبات کو اس طرح
ے۔ کہ ذہن فوراً "انسان کامل" کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے۔ اور یہی تاثر
ضمیر میں بھی رہا ہے۔

قبال کے نزدیک "مردِ کامل" کا تصور محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور ہے

ان را پیامِ آخریں حاملِ او رحمۃٌ للعالمیںؐ
(اسرارِ خودی)

. تو پھر، کیا زمین، کیا مہر و مہ، کیا آسمان تو بتو، سب اس کی زد میں ہیں۔ ؎

ا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے　　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(بالِ جبریل۔ غزلوں کا دوسرا سلسلہ غزل ۳۱)

ں کی طرح میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ اقبال نے بار بار مسلمانوں کو کیوں مخاطب
ِ آئینِ پیغمبرؐ پر کیوں اتنے نازاں ہوئے؟ کیا اس وجہ سے ان کی شاعری محدود
ں ہوئی؟ عظیم شاعری تو آفاقی اور دائمی ہوتی ہے۔ اسے ہر زمانہ، ہر خطہ اور
ں قبول کر لیتا ہے۔ کیا اقبال کی شاعری میں اس قبولیت کے آثار رہیں؟
کہ بے سوچے سمجھے اس سوال کا جواب نفی میں دینا مناسب نہ ہوگا۔ اور
طلب بھی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر یہ حقیقت ذہن نشین رہنی
بان کی عظیم شاعری میں مذہبی عناصر رہے ہیں۔ اور دنیا کا ہر بڑا شاعر اپنے مذہب
ہے۔ مگر اس مذہب کی وجہ سے اس کی شاعری کبھی محدود نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے
ی بھی محدود نہیں سمجھی جائے گی۔ اور نہ یہ کہا جائے گا، کہ اسلام کی وجہ سے وہ مجروح
سری اہم بات یہ ہے کہ اقبال کو غم صرف زوالِ مومن کا نہیں۔ حقیقتاً غم
ل کا ہے۔ ؏　　زوالِ آدمِ خاکی زیان تیرا ہے یا میرا!
(بالِ جبریل۔ غزل کا حصہ اول ۲)
ہ دیکھو! انسان کس طرح ابلیسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اور انسانیت کی
لیے ٹوٹ رہی ہیں! یہ منظر قابلِ برداشت ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا اس
ے انسان نکل سکتا ہے؟ کیوں نہیں؟ تو پھر کون سا امر مانع ہے؟
لوگ ایسے ہیں۔ جنھیں ابلیس زدہ ہونے کا احساس نہیں یا ہے تو کچھ پروا
نہیں نجات کی کوئی مناسب ترین صورت نظر نہیں آتی۔ اقبال یہی کرتے ہیں کہ

ان انسانوں کو ابلیس زدہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ انھیں غور و فکر پر آمادہ کرتے ہیں اور نجات کا جو واحد راستہ ہے۔ "الاسلام" اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بے پیرویِ اسلام زوالِ آدم یقینی ہے۔ اور پیرویِ اسلام ضامن عروجِ آدم ہے۔

یہ گفتگو کسی مذہبی تعصب کی بنا پر ہرگز نہیں۔ آپ کے پاس ذرائع معلومات کی کمی نہیں ہے۔ آپ قوتِ مشاہدہ اور تابِ تجزیہ بھی رکھتے ہیں۔ قوانینِ فطرت، ادیانِ عالم اور مختلف نظریات و نظام ہائے حیات پر جو متعدد اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ آپ نے ان کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ عقلی اور استدلالی طور پر ہی اخذِ نتائج کیجیے۔ آپ کی روشن دماغی اور راستِ فکری صرف ایک حقیقت تک آپ کو لے جائے گی۔ وہ یہ کہ اللہ کے نزدیک دین، صرف 'اسلام' ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ　　　تحقیق دین نزدیک اللہ کے اسلام
اَلْاِسْلَامُ۔ (آلِ عمران۔ آیت ۱۹)　　　ہے۔

لہٰذا جو اسلام کا پابند ہوا وہی کامیاب ہے۔ اور دنیا کی تاریخ نے اس کی مثالیں بھی فراہم کر دی ہیں۔

شاید آپ کہیں کہ دنیا میں مسلمان تو آج بھی ہیں۔ اور کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ پھر وہ کیوں ناکام و نامراد اور مایوس و پریشان حال ہیں؟ اور کیوں اس اللہ کی شکایتیں کرتے پھرتے ہیں جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ میں آپ کی توجہ "ام الکتاب" کی ایک خاص آیت کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا۔ اور یہ کسی جانبداری کی وجہ سے نہیں۔ ایک آفاقی اور دائمی صداقت پر اُس یقین کی بدولت جو مجھے حاصل ہے ام الکتاب کہتی ہے:

ـهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا		اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ داخل ہو جاؤ
السِّلْمِ كَاۗفَّةً ص وَّلَا	(البقرہ ۲۰۸)	اسلام کے سارے۔ اور مت پیروی
ـوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط		کرو قدموں شیطان کی تحقیق وہ
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝		واسطے تمہارے دشمن ہے ظاہر،

غور امر یہ ہے کہ یہاں دوسروں کو نہیں۔ ایمان والوں کو ہی اسلام میں پوری
ہونے کو کہا جا رہا ہے۔ تو، جب تک وہ مسلم کامل نہیں بنتے، کامیابی انکی طرف
سکتی ہے۔ ایسے مسلمان حاملِ اسلام نہیں۔ ان ہی کو نمونہ بنا کر اسلام کو سمجھنا
ی نقصان پہنچانے والی غلطی ہوگی۔ البتہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اسلام اب نیم مردہ
و گیا ہے، یہی احساس اقبال کو بھی تھا۔ ایک ناگزیر شے کیوں ہمارے ہاتھ سے
ہے۔ پھر ہمارے پاس ہماری بہتری اور ترقی کے لیے رہے گا ہی کیا۔؟ چنانچہ وہ
شتہ کی بازیافت کرتے ہیں۔ اس میں کسی ایک گروہ ایک خطہ ایک وقت
یہ کا فائدہ نہیں۔ سارے زمانے اور پوری انسانیت کی منفعت پوشیدہ ہے۔
ں کے پیغام کا پس منظر یہ ہے کہ بشر ہی خلافت و نیابت الٰہی کی ذمہ داریاں
۔ وہی دنیا میں خیر کا راج قائم کر سکتا ہے۔ وہی ابلیس کو سرنگوں کر سکتا ہے۔
نسانی کی شاہراہ پر سنگ منزل نصب کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہی ان امور کا
ر نہیں ہے کوئی۔ اور اس کی نظیر صرف قلب مسلماں ہی ہے۔ اور نہیں ہے
طور پر اقبال کے پورے اردو و فارسی کلام اور خاص طور پر ابلیس سے متعلق
ا تیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ابلیس کے تعلق سے لکھی گئی نظمیں یہ ہیں۔

و ابلیس" اور "ابلیس کی عرضداشت" (بال جبریل)

"تقدیر" اور "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" (ضرب کلیم)

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" (ارمغان حجاز)

"انکار ابلیس" اور "اغوائے آدم" (پیام مشرق)

"نمودار شدن خواجۂ اہل فراق ابلیس" اور "نالۂ ابلیس" (جاوید نامہ)

یعنی اردو میں پانچ ۵ اور فارسی میں چار ۴ نظمیں ابلیس کے متعلق ہیں۔

ان نظموں کے تجزیے سے ابلیس، انسان اور بشر کے متعلق اقبال کے کئی بنیادی خیالات روشن ہوتے ہیں:۔

۱۔ ہم نشینیِ ابلیس سے انسان کا مزاج اور طریقۂ فکر اتنا بدل گیا ہے کہ اسے اپنی آزادی بھی آزادی نہیں معلوم ہوتی۔ آزادی سے کام لیتے ہوئے بھی وہ سمجھتا ہے۔ کہ مجبور ہے اور مشیت کو یہی منظور تھا۔ ابلیس خدا سے کہتا ہے۔

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر   آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا   ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

خدا پوچھتا ہے:۔

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس جواب دیتا ہے۔

بعد! اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود

تو خدا فرشتوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے:۔

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے   کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام   ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود
(تقدیر۔ ضرب کلیم)

راد جو ہر امر میں مشیت کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ ابلیس کے پردے
نے میں۔ اقبال انھیں بتاتے ہیں کہ یہ حجت پستی فطرت کی غماز ہے۔
ں نے ابلیسی نظام کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی ہے۔ اس کی وجہ سے
یں ہی فتور نہیں آیا۔ معاشرت میں بھی بگاڑ پیدا ہوا۔ مذہب بھی بے اثر
ن بھی انحطاط پذیر ہوا۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ

است ساختۂ "ابلیساں" ؎

یس آگ سے تو نے   بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(ضربِ کلیم۔ سیاستِ افرنگ)

ن خاکی (سیاست دان) فسادِ عصرِ حاضر کے ذمہ دار ہیں۔ ابلیس ناری
ں ہے، اس لیے چبا چبا کر باتیں کرتا ہے۔ ؎

ارباب سیاست   باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

(بالِ جبریل۔ ابلیس کی عرضداشت)

سیاست ایسے مطیع اور فرمانبردار ہیں کہ مگر ان کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں
پنی خدمت سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سیاسی فرزندوں
تا رہتا ہے۔ برہمنوں کو مندر سے نکالدو، شیخ حرم سے روح محمدؐ
کو نئے نئے فرنگی تخیلات دے دو تاکہ وہ جہادی دستگیری کے سدا
ں ہوا۔ جس بندۂ مومن کی پامردی پر خدا کو بھروسا تھا۔ وہ خود مشیت
سا کرنے لگا۔ وہ دوسروں کے لیے نمونۂ تقلید کیا بنتا کہ خود ہی مشکوک
ب کوتوال خود اپنے محکمے کی افادیت پر شبہ کرنے لگے تو نتیجہ ظاہر ہے۔

اتنا ہی نہیں، انسان ابلیسانِ خاکی کا شکار ہو گیا۔

بشر تا از مقامِ خود فتاد است   بقدرِ محکمی اورا کشاد است
گنہ ہم می شود بے لذت و مرد   اگر ابلیسِ تو خاکی نہاد است
(ارمغانِ حجاز۔ ابلیس خاکی و ابلیس ناری)

یہ تو اور بھی ذلت کی بات ہوئی۔ کیونکہ ابلیس ناری تو یزداں دیدہ و کامل عیار تھا۔ ان ابلیسانِ خاکی کی کیا انفرادیت و تخصیص ہے۔؟ اس لیے۔ ؎

مشو نخچیرِ ابلیسانِ این عصر   خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہمہ ابلیس خوشتر   کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است
(ایضاً)

اس بحث سے یہ نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک دین سے جدا ہو کر تمام نظام ہائے سیاست ناقص و بے فیض رہ جاتے ہیں۔ ان سے ابلیسیت تو فربہ ہوتی ہے۔ آدمیت نہیں نکھر سکتی۔ ایسے نظام میں رہ کر انسان دوں نظر و کم حوصلہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ ابنِ آدم پر ابلیس کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ گراں باری فتوحات سے اس کا جی متلانے لگا ہے۔ ابلیس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کرتا۔ صیاد سے صید خود کہتا ہے کہ مجھے پکڑ لو۔ یہ فرماں پذیری! الاماں۔!! پھر کیوں نہ ابلیس اترائے۔ اور نشۂ غرور عاجزانہ اور ملتجیانہ روش اختیار کرے۔ جس کی صلب میں طنز شدید کا مادہ بھی موجود ہو۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب   من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر برنتافت   چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بیگانہ   از شرارِ کبریا بیگانہ
صید خود صیاد را گوید بگیر   الاماں از بندۂ فرماں پذیر

ں صیدے مرا آزاد کن   طاعتِ دیروزۂ من یاد کن

ازو آں ہمتِ والائے من   وائے من اے وائے من اے وائے من

او خام و عزم او ضعیف   تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف

صاحب نظر باید مرا   یک حریفِ پختہ تر باید مرا

آب و گل از من باز گیر   می نباید کودکی از مرد پیر

م چیست؟ یک مشت خس است   مشت خس را یک شرار از من بس است

عالم اگر جز خس نبود   ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود

بگداختن عارے بود   سنگ را بگداختن کارے بود

تنگ از فتوحات آمدم   پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم

رو از تو می خواہم بدہ   سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ

اید کہ بپیچد گردنم   لرزہ اندازد نگاہش در تنم

گوید از حضورِ من برو   آں کہ پیشِ او بیرزم با دو جو

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست
([illegible])

ب حیلہ شعری ہے کہ ابلیس کو ایسی باتیں کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے، مگر اس سے ضرور روشن ہوتی ہے۔ یہ احساس ضرور جاگتا ہے کہ ابلیسیت کا جواب کیسے بنے؟ اس کے جادو سے کون مسحور ہو جاتا ہے۔ اور کون مسحور نہیں ہو سکتا۔ ر ہو جا سکتے ہیں، الا عبادك المخلصین ؎۔

یاست کیا کلیسا کے شیوخ   سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
(ارمغانِ حجاز۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ)

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے   جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یعنی امت مسلمہ۔ اور یہ امت جوابِ ابلیس کیسے بنے گی؟ حاملِ قرآن و سنت ہو کر، صرف مسلمان ہونا کافی نہیں۔ حبل المتین کو تھامنا ضروری ہے۔ جو بھی حاملِ قرآن و سنت ہو گیا۔ اس نے شروعِ دینِ محمد یا نظامِ "بشر" کو آشکار کر دیا۔ وہ زندہ مردِ حق پرست ابلیس کا حریفِ پختہ تر ہو گیا۔ ہمہ جہتی انحطاط کا شکار یہ عصرِ حاضر ایسے ہی زندہ مردانِ حق پرست کا منتظر ہے۔

ایسی ہستیوں کو ورغلانے کے لیے ابلیس کے نزدیک کیا چالیں ہو سکتی ہیں انھیں ابلیس کی "مجلس شوریٰ" میں فاش دیکھیے:۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے   یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے۔
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے   تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر   جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے   پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ابن آدم کو چاہئے کہ ان چالوں سے ہوشیار رہے۔ ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرنا ہے۔ اور حزب اللہ میں شامل ہو کر ابلیسیت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔

۴۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے۔ کہ اقبال کو ابلیس سے ہمدردی ہے (اقبال ایک مطالعہ۔ ص ۳۹۳ اور ص ۴۱۲) مگر جو تفصیل بیان کی ہے وہ محلِ نظر ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کو ابلیس سے ہمدردی تکبر کی وجہ سے ہوئی اور چونکہ ان کے مزاج میں ابلیسیت کا جز تھا۔ اس لیے نظریۂ خودی پر اس شرح و بسط سے لکھا ہے، مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں۔ اقبال کو بلاشبہ ابلیس سے ہمدردی ہے مگر اس کے تکبر کی وجہ سے

ظم فکر، محکم یقین، مسلسل عمل اور بنہایت ہوشیاری کی وجہ سے، جس کی مثال
یس کے سوا کوئی دوسرا پیش نہیں کر رہا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے۔ ؎

ر پردۂ لا گفتہ ام   گفتہ، من خوشتر از ناگفتہ ام

(جاوید نامہ نمودار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس)

س کی منظم فکر اور بنہایت ہوشیاری کا اندازہ ہوتا ہے، تکبر کا نہیں۔
ے میں در اصل بلیٰ کہا ہے کیونکہ وہ دردِ آدمؑ رکھتا تھا۔ لا کہہ کر
دل کر لیا:۔

رِ آدم داشتم   قہر یار از بہر او نگذاشتم (ایضاً)

نہ رکھتا تو اس کے واسطے خود کیوں جنجال میں پھنستا۔ مگر ابن آدم
تعی درد آدم رکھتا ہے؟ وہ اس طرح سمجھے کہ ابلیس ہی کی وجہ سے
وق نمو ہے۔ اور ؎

شت زار من دمید   او ز مجبوری بہ مختاری رسید
انمودم آشکار   با تو دادم ذوقِ ترک و اختیار
(ایضاً)

بلی کہہ دیتا تو یہ صورت کہاں ہوتی۔ قصۂ آدم تو (ڈراما Plot)

عتا حقیقت ہے۔ اقبال نے اس کو صرف راندۂ درگاہ کی حیثیت
ر کی حیثیت سے بھی سمجھا ہے، غالباً اسی وجہ سے انھوں نے ابلیسیت
ح پر لکھا ہے۔ اور کاروبار ابلیس پر معروضی اور فلسفیانہ نگاہ بھی تو ڈالی
ی حس ایسے نکتے پیدا کر گئی ہے جس میں اجنبیت بھی ہے اور کشش بھی۔

اقبال کے خیال میں ابلیس کی قابل رشک صفتیں یہ ہیں۔

اول ۔ انسانوں میں ذاتیں اور فرقہ بندیاں ہیں۔ اور ان کے ہولناک نتائج بھی گردوں نے دیکھے ہیں۔

رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نرشت   کعبہ را کردند آخر خشت خشت
(ایضاً)

لیکن ابلیس کہتا ہے:۔ ؎

کیشِ ما را ایں چنیں تاسیس نیست   فرقہ اندر مذہبِ ابلیس نیست
(ایضاً)

شاید یہ خدا پر بھی طنز ہے۔ جس نے کہا ہے:۔

وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ   اور کیا ہے ہم نے تم کو کنبے اور قبیلے
لِتَعَارَفُوْا (الحجرات آیت ۱۳)   تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔

طنز سے قطع نظر، کیا یہ سچ نہیں کہ فرقہ اندر مذہب ابلیس نیست؟

دوم ۔ اس کے یقین محکم کا عجب حال ہے! اس نے آتش نمرود کو گلزار ابراہیمؑ بنتے دیکھا۔ اسمٰعیلؑ کی فرزندی دیکھی۔ وہ برادران یوسفؑ میں شامل رہا۔ اس نے دربار فرعون سے دریائے نیل تک کا تماشا کیا۔ عیسیٰؑ کو صلیب سے پرے دیکھا۔ قریشیوں کی غار حرا تک رسائی دیکھی۔ وہ طائف کی گلیوں میں اوباشوں کے ساتھ رہا۔ شہنشاہ حبشہ کے محل تک پہنچا۔ خانۂ کعبہ کے وسیع صحن میں مسکراتا رہا۔ بدر و حنین میں اس نے ذلتیں اٹھائیں۔ کعبہ سے کربلا تک بشریت کی پامردی اور حق کی سربلندی دیکھی۔ غرض سینکڑوں پیغمبر دیکھے اور بارہا اس کی چالیں ماری گئیں۔ پھر بھی وہ اپنی کافری پر اب تک نازاں ہے۔ ؎

غرق اندر رزم خیر و شر ہنوز   صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

کیا ایسا یقین جو کسی حال میں متزلزل نہ ہو۔ انسانوں کو حاصل ہے؟ ۔

ساحل پسندی ابلیس کی خو نہیں۔ وہ ساحل سے نظارہ نہیں کرتا۔ تلاطم ہائے
ہے۔ موجوں کے تھپیڑے کھانے میں اسے لذت ملتی ہے۔ اور اس کا گرداب
و پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جہدِ مسلسل اس کی زندگی کی روح اور اس کا مدعا ہے

درعمل چوں زاہدان سخت کوش (ایضاً)

ناہ قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کی جنگ اس دمِ آخر تک ہوتی ہے،
شکست کھا کر مطیع نہ بن جائے۔ ؎

ت پا، الیاس بھی بے دست و پا میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

(بالِ جبریل۔ جبریل و ابلیس)

ن آدم چیست؟ یک مشتِ خس است (نالۂ ابلیس)

ے ابلیس کا ایک شرارہ کافی ہے۔

شتِ خس را یک شرار از من بس است

ری نہیں کہ ابلیسیت کے خلاف طاقت کا مظاہرہ ابن آدم بھی کرے؟
ں سے ہرگز کام نہ لے۔؟
ابلیس خود شناس و خود نگر ہے، یہ نہیں کہ آج ہوا۔ وہ انکار سے پہلے بھی تھا۔ ؎

دان نیم سجدہ بہ آدم برم او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم

(پیامِ مشرق۔ انکارِ ابلیس)

بلیس کا تکبر کہا جاتا ہے۔ لیکن اقبال کے رومانی اندازِ فکر میں یہ تکبر نہیں۔ وہ
ں سمجھتے ہیں جو عیب کی بات نہیں۔

واقعتاً یہ خود شناسی فقط ابن آدم کو زیبا تھی۔ لیکن اس نے کبھی اپنی شناخت کی کوشش نہیں کی۔ اور جب اپنی شناخت ہی نہیں کی گئی تو ذمہ داری کا احساس کیا ہوتا؟ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے پہلے اپنے مقام و منصب کو سمجھنا ضروری ہے، اور اپنے مقام کی آگہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی۔ جب تک خود تلاشی نہ کی جائے۔ ابلیس نے تکبر نہیں کیا۔ اپنی تلاش کی، اپنے مقام و منصب کو سمجھا۔ اور اپنے فرائض نبھائے۔

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات من بہ دو صرصرم من بہ غوِ تندرم
رابطۂ سالمات ضابطۂ امہات سوزم و سازمے دہم آتشِ مینا گرم
ساختۂ خویش را در شکنم ریز ریز تا ز غبارِ کہن پیکرِ نو آورم

اور ان اشعار کو یاد کیجیے جو بالِ جبریل کی نظم "جبریل و ابلیس" میں ابلیس کی زبانی ادا کیے گئے ہیں۔ بالخصوص یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا؟

(جبریل و ابلیس)

ابلیس چاہے تو وصل نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے وردِ لاتقنطوا وظیفۂ ناروا ہوگا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اس کی نومیدی (تقنطوا) کے سبب کائنات میں سوز و ساز، درد و داغ اور جستجو و آرزو قائم ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بے سوز و ساز ہو کر دنیا بہ باد ہو جائے۔ وہ اگر وصل خواہ ہوا تو اس کا انفرادی وجود کہاں رہے گا اور وہ نہیں رہے گا تو یہ جہانِ رنگ و بو کیونکر برقرار رہ سکے گا؟ اور دنیا تو دنیا، خود خدا بھی اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔

برلبم از وصل می ناید سخن وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من
(نمودار شدن خواجہ....)

س کو اقبال بہت آگے لے گئے ہیں۔ انھوں نے نظریۂ وصل وفراق مرتب کرکے

ں خلاصہ یہ ہے۔ ؎

ی، ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام
(پیام مشرق۔ اغوائے آدم۔)

وجہ سے وہ ابلیس کو "خواجہ اہل فراق" سمجھتے ہیں۔ شوق بمیرد ز وصل کو انھوں نے

م "ذوق وشوق" میں بھی پیش کیا ہے۔

یں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

وق" ایک نعتیہ نظم ہے۔ اقبال کی تمنا رہی کہ دربار مدینہ دیکھیں۔ لیکن وہ تمنا

جران کا مقدر تھا۔ اور لذت طلب کشید کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے کوچ

زو کو زندگی میں پورا ہوتے ہوئے نہ دیکھ کر انھوں نے وصل فراق کے فلسفے سے

حاصل کرلی۔ یہاں اس پہلو پر مزید گفتگو کرنے کی ہمارا اصل موضوع اجازت

س گفتگو کا سلسلہ یہ چل رہا ہے کہ ابلیس نہایت خود شناس اور منصب فہم

ذمہ داریاں اپنے اوپر واجب کرلی ہیں، ان سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل

ں کا اپنا مقصد ہمیشہ پیش نظر ہوتا ہے۔ ابن آدم میں گھل مل کر بھی، اخلاق

ظاہرے کے باوجود بھی وہ اپنی روش کو نہیں چھوڑتا۔ اور یہ ٹھیک ہی ہے

ہے کہ کائنات اسی کے دم سے روشن وزندہ وفعال ہے تو اسے غفلت

چاہئے۔ اور نہ کسی لالچ (مثلاً خواہش وصل وغیرہ) میں آنا چاہئے۔ اسے

فطرت پر قائم رہنا چاہئے۔

اس تناظر میں اقبال انسانوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ جب ابلیس کے سوچنے کا یہ انداز ہے تو ابن آدم کیوں نہیں سوچتا کہ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔؟ اور وہ دین سے بیزار و بے پروا کیوں ہے۔ دین تو اس کی فطری اور لازمی ضرورت اور اس کی شخصیت کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے۔ اور تمام انسانوں کے لیے دین ایک ہی ہے۔ اسی واحد دین فطرت ۔ الاسلام ۔ پر ہر انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو وہ تفقہ سے کام کیوں نہیں لیتا؟ کیا ابلیس کے کارنامے انسان کی آنکھ کو کھولنے کے لیے کافی نہیں۔ بحکم ابلیس انسان کا کھلا دشمن ہے،

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝
تحقیق وہ واسطے تمہارے دشمن
ہے ظاہر۔
(۲ البقرہ۔ آیت ۲۰۸)

"عَدُوٌّ مُّبِین" سے ظاہر ہے کہ ابلیس مار آستین نہیں، دشمن نمایاں ہے۔ وہ انسان کو علی الاعلان مبارزت کی دعوت دیتا ہے۔ ؎

کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

اور

کارگہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
(ایضاً)

ملٹن نے اپنے رزمیہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شیطان کو انسان سے تعارض نہ تھا۔ وہ تو دراصل خدا سے اپنی بے حرمتی اور شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن بدلہ لینے کی بہترین تدبیر اس نے یہ سوچی کہ خدا کی کمزور ترین مخلوق ۔ انسان ۔ کو تختۂ مشق بنایا جائے۔ انسان کمزور ترین بھی ہے اور خدا کی نگاہ میں عزیز ترین بھی۔ اس کی پسپائی سے یقیناً خدا کو بیش از بیش دکھ ہوگا۔ لیکن اقبال کی فکر کے مطابق ابلیس نے تمام مخلوقات میں صرف

چا کر یہی جوڑ بن سکتا ہے، انسانوں میں بھی جو خلقاً اور مزاجاً کمزور ہیں،
نہیں۔ وہ کامل عیار ہے تو حریف بھی پختہ تر چاہتا ہے۔ حریف پختہ تر
لتا ہے۔ تو صرف انسانوں میں۔
ان کے محاربہ کو ملٹن نے بلاشبہ رزمیہ کا روپ دیا ہے۔ اقبال نے رزم
نہیں کی۔ لیکن انھوں نے اس معلوم و مشہور واقعے سے جو مضمون
ی طرف ملٹن کا ذہن بھی نہیں گیا تھا۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ابلیس
ب ہی کہا ہے۔ کیونکہ وہ آدم کا درد رکھتا تھا۔ اور اسے مجبوری سے مختاری
ت تھا تو بلاجھجک کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے حدیث ابلیس و آدم میں
یا ہے۔ جس کی مثال ہمیں مغربی ادب میں نہیں ملتی۔ واقعۂ آدم و ابلیس
اخلت کی مثالیں اس مقالے میں اور بھی پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے
ن اور بعض کو مشرقی مفکرین مثلاً رومی یا محی الدین ابن عربی کے خیالات
لی خیالات ان کے کشیدہ فکر ہیں۔ ان میں کہیں کہیں تطابق مشکل سے ہوتا
سار میں شعری تخئیل کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ ان کی کئی نظموں کی شروعات
ا ہیں لیکن جلد ہی وہ افکار کی دنیا میں جا پہنچے ہیں۔ اور وہاں جو قیمتی جواہر ریزے
دل نہ ہوں، ان کو اقبال نے ملتشت شاعری میں سجا دیا ہے۔ اس لیے
ختلف اور کبھی کبھی متضاد قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ ملٹن کے یہاں یہ
عۂ آدم کے سانحے کو فردوس گم گشتہ (Paradise Lost) اور
وہ داستان کو فردوس باز یافتہ (Paradise Regaine)
وہا اور مسلسل طور پر پیش کرتا ہے۔ اور خود بظاہر غیر جانبدار رہ کر خدا اور

شیطان، دونوں فریقوں کی فوجوں کی انتہائی جد و جہد اور کشمکش کو دکھاتا ہے۔ اور رزمیہ نگاری کی تمام ضروری شرطوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا رزمیہ عظیم شاعری کا نمونہ بن گیا ہے۔ اقبال کا نظام فکر منظم ہوتا۔ اور وہ اسے ایک ہی دو نظموں میں تفصیل و طوالت سے پیش کرتے تو بڑے رنگ شاعری کا تاثر زیادہ قائم ہوتا۔ ابھی صورت یہ ہے کہ نو نظموں میں خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں چار فارسی نظمیں ہیں۔ اور فارسی نظموں میں خیالات زیادہ انوکھے قسم کے ظاہر ہوئے ہیں۔ سبھوں کو یکجا کر کے ان میں تنظیم پیدا کرنا آسان کام نہیں۔

یہ طویل اقتباس جملۂ معترضہ کے طور پر ہے۔ آپ اپنے ذہن کو اس اقتباس سے اوپر کے جملوں کی طرف لے جائیے۔ ان کے تسلسل میں یہ کہا جائے گا۔

ابلیس ایک مستقل نار ہے۔ اس کے استقلال کا عجیب عالم ہے!۔

یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ انسان اس کی کمر کو توڑ سکتا ہے۔ وہ اڑا ہوا ہے۔ شاید اس کی نفسیات میں یہ بات ہے کہ اس نے خدا سے باضابطہ معاہدہ کر لیا ہے۔ اور خدا سے کچھ اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ وہ اختیارات انسانوں پر حکمرانی کے لیے کافی ہیں۔ خدا نے بلاشبہ ابلیس کو کچھ اختیارات دے دیئے ہیں لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کیا وہ خدا انسانوں کو اختیارات عطا کرنے میں بخل کر گیا؟ نہیں، نہیں۔ ہم ہی ناشکرے ہو گئے۔ اپنے مفوضہ اختیارات کی نوعیت و ماہیت کو نہیں سمجھے اور بزدلی کی طرف مائل ہو گئے۔ ورنہ انسان کو تسخیر کے جن وسیع ہمہ گیر اور دائمی امکانات سے آشنا کیا گیا ہے۔ ان کے پیش نظر ابلیس کو فنا شدہ، مذکور ہی نہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ اپنی اہلیت کو شعوری طور پر محسوس کرے اور شرف انسانی کے ممکنات سے کام لے۔ ابلیس انسان کا کھلا دشمن ہے تو لازم ہے کہ انسان بھی ابلیس کا کھلا دشمن بن جائے۔ ابلیس کی دشمنی محتاج رعایت نہیں۔

کی خواہش ہے کہ انسان ابلیس سے سبق حاصل کرے۔ جیسے مدعی کی چستی سو
ہے۔ ابلیس کے عزائم، اس کے طریق کار اور معاشرۂ انسانی میں اس کی
ین وخفیہ اثرات کو اس تفصیل سے پیش کیا گیا ہے کہ انسان وہ وشبہ
ے۔ اقبال نے تخلیق ابلیسیت کے لیے ہی ابلیس پر اتنی توجہ مرکوز کی۔ ابلیسیت
ض ہے۔ اس کا علاج وہ سارے لوگ کریں گے۔ جن کے اندر بشر کی حقیق
ایک اہم ترین اور ناگزیر صفت یہ ہے کہ زمین کے ہنگاموں سے بے تعلق نہیں
ت زمین کے نیچے اور آسمان کے اوپر یعنی قرار جنت و دوزخ کی باتیں بشریت
یا سے وہ تعلق رکھنا جو اس کا حق ہے۔ بشر کے شایان شان ہے۔ ورنہ ہاتھ
ں خیال طوافت کرتے رہے کے ہوتے ہوئے ہمارا معاشرہ پاک وصاف نہیں رہ سکتا۔
ط کاری دیکھتے رہیں گے۔ اور ہمت نہیں ہوگی کہ ٹوک بھی سکیں۔ ظاہر ہے
ت وکوشش کا مظاہرہ نہایت ضروری ہے۔ ابلیس سے پہلوتہی کر کے ہم
نہیں سکتے۔ اس سے نبرد آزما ہونا ہی پڑے گا۔

کا منکر ابلیس ہونا مفید ہے۔ نہ ممکن۔ بشریت کی اعلیٰ موثر اور لائق تحسین
یس کا وجود لازمی ہے۔ ابلیس! اقبال کے خیال میں صرف مانع نہیں۔
جو نہ ہو تو بشر کی راہ میں رخنے کون ڈالے گا۔ اور رخنہ اندازی نہ ہو تو
سے آشکار ہوں گی۔ ابلیس رخنہ ڈال کر اصل بشر کو آمادہ بہ اظہار لیاقت کرتا ہے۔ اور
ں نہفتہ صلاحیتیں ابھر آتی ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔ ؎

جاتے ہیں نالے   رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ب کے ساتھ مخصوص نہیں۔ عام انسانی فطرت کا یہی خاصہ ہے اور

بے جان چیزیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اسی خاصہ سے روشنی حاصل کر کے نیوٹن نے عمل اور ردعمل کا عالمگیر قانون وضع کر دیا۔ اور اسی خاصہ کے تحت ابلیس کی مداخلت بشر کے تفاعل کا محرک بن جاتی ہے۔

ع ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو (بال جبریل و ابلیس)

ناگزیریت ابلیس کا ایک اور اہم پہلو ہے، غالب ہی نے کہا تھا۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اقبال نے اس سے اپنے فلسفۂ ابلیس و آدم میں مدد لی۔ ان کے خیال میں آئینہ بشر کی لطافت پوری طرح جلوہ آفرینی کیسے کر سکتی: لازم ہے کہ اس کی پشت پر کوئی لیپ ہو۔ یہ لیپ ابلیس ہے۔ اقبال نے خودی، عشق، جہد و عمل کے جو نمونے آئینہ رجال میں دیکھے وہ اس وجہ سے پرکشش، عظیم اور لازوال نظر آئے کہ ان کا مقابل ابلیس تھا۔ اور بالآخر وہ آئینہ بشر کا زنگار بن گیا تھا۔ تو ابلیس کو صرف حریف سمجھنا درست نہیں، اسے اپنی شخصیت کا زنگار بنا لینا روا ہوگا۔ اس نکتے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے۔ کہ ابلیس کو پس پشت ڈال دینے کی ضرورت ہے، پھر وہ وجہ نزاعِ خیر و شر نہیں بالآخر خیر ہی کا معاون بن جائے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ دشمن بھی ایک طرح سے حق دوستی ادا کرتا ہے۔ وہ جتنا قوی ہوگا۔ اتنے ہی مقابلے کے امکانات روشن ہوں گے۔ اس لیے اس کے وجود کو خدا کے فضل کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اس فکر کو اقبال نے ان شعروں میں پیش کیا ہے۔

راست می گویم عدو هم یار تست   هستی او رونق بازار تست
هر که دانائے مقامات خودی است   فضل حق داند اگر دشمن قوی است
کشتِ انساں را عدو باشد سحاب   ممکناتش را بر انگیزد ز خواب
(اسرار خودی)

ان اشعار سے اقبال کا نظریہ خیر و شر واضح طور پر مستخرج ہوتا ہے۔ جب ابلیس یار انسان
. تو پھر شر کا مخرج کہاں رہا؟ خیر سے شر کا مخرج جدا نہیں۔ یہ ایک ہی شاخ کے خار و گل ہیں،
ں نے اس فکر کو نہایت لطیف پیرایہ میں یوں ادا کیا ہے :-

چہ گویم نکتہ زشت و نکو چیست زباں لرزد کہ معنی پیچیدار است
برول از شاخ بینی خار و گل را درون او نہ گل پیدا نہ خار است

(پیام مشرق)

لیکن جب آپ نے بروں از شاخ خار و گل کو دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ سیر خار خسا
چھیڑتا ہے۔ تو آپ نے نظم گلستان کی ضرورت سمجھی۔ میرے خیال میں اقبال نے یہاں
ت کو "شاخ" کے استعارہ میں نہایت بلاغت سے پیش کیا ہے۔ بشریت میں خار و گل
ں کے خواص ہیں۔ ان کا مخرج الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا اور
نہیں۔ بشر دونوں کی صفتوں کا حامل ہے۔ پھر بھی تنظیم گلستان کی ذمہ داری اسے
گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا شر محض شر نہیں ہوتا۔ وہ خیر کا تابع ہوتا ہے چنگیزیت کے
ت اس کی قوت مہابھارت، بدر و حنین اور کربلا میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ قوت انسانی قبا کو
ہیں کرتی، رفو کرتی ہے۔ مگر یہ قوت ہمیشہ ترتیب کی محتاج ہے، اس کی تربیت اب بے پیروی
بغیر ممکن نہیں۔ اور پیروی نصف و ناقص نہیں۔ کامل و واضح ہو تو فخری قوت با ابلیس بھی
ر ہے۔ اس لمحہ درون بشر خیر و شر یکجا و ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور صرف ایک صفت
و فعال ہوتی ہے۔ خیر کثیر۔ یہی حقیقت بشر ہے۔ اور اس کو ہر تا بندہ کی تلاش خدا کو
ہے۔

قدم در جستجوے آدمی زن خدا ہم در تلاش آدمی ہست
(لالۂ طور۔ پیام مشرق)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی سوانح حیات

القول الجلی و اسرار الخفی کا نسخۂ خدا بخش ـــ ایک تعارف

از جناب فضیل احمد قادری خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شیخ محمد عاشق پھلتی کی نوشتہ حیات شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۶۲) کا ایک قدیم مگر ناقص مخطوطہ موجود ہے۔[1] مگر مخطوطے پر اس کتاب کا نام افادات شاہ ولی اللہ تحریر ہے۔ راقم الحروف جب خدا بخش لائبریری آیا تو اس کے ذمہ تصوف اور صوفیہ کے تذکروں کی کیٹلاگ سازی کا کام تفویض ہوا۔ دوران مطالعہ اس کتاب کے اندرونی صفحات پر دو جگہ القول الجلی لکھا ہوا ملا۔ میں نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کی کتاب شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات[2] کے ضمیمے سے استاذ محترم کے مضمون مولانا محمد عاشق پھلتی کی نوشتہ حیات شاہ ولی اللہ المعروف بالقول الجلی و اسرار الخفی کا تعارف سے اس کا مقابلہ کیا۔ نسخہ ہذا کے مندرجات مل گئے۔ اور راقم الحروف کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔[3] پھر جب ۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کو استاذ محترم پٹنہ تشریف لائے تو

---

[1] فارسی مخطوطات، ج ۴ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۴۸۹۔ یہ نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی سے ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو خرید لیا گیا۔ [2] مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۹ء شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات بھی شیخ محمد عاشق پھلتی نے جمع کئے تھے اگرچہ اس کی ابتدا انکے صاحبزادے شیخ عبدالرحمٰن نے کی تھی۔ مگر ان کی بے وقت موت کے بعد اس کی تکمیل شیخ محمد عاشق نے کی۔ سیاسی مکتوبات، ص ۵۰۔ [3] القول الجلی و اسرار الخفی کا تعارف سب سے پہلے استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے نسخۂ کاکوری جو واحد مکمل نسخہ ہے کی بنیاد پر شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات کے ضمیمے میں پیش کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ دوسرا نامکمل نسخہ متعارف کرانے کی سعادت استاذ محترم کے ایک ادنیٰ شاگرد کے حصے میں آئی۔

ایا گیا۔ انھوں نے اپنی تشفی کا اظہار کرتے فرمایا کہ غنیمت ہے۔ محب مکرم جناب مسعود شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جن کا تعلق خانوادۂ کاکوری سے ہے اور جن کے پاس لمی نسخہ موجود ہے۔ انھیں بھی میں نے یہ نسخہ دکھایا۔ ان کی رائے ہے کہ اگرچہ نسخہ ر لاول ہے۔ مگر بقیہ حصے پورے ہیں۔ اور نسخہ کاکوری سے پوری مطابقت ہے۔

ی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات میں۔ استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد القول الجلی و اسرار الخفی کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

ہ مولانا محمد عاشق پھلتیؒ نے شاہ صاحبؒ کے حالات، سوانح اور ملفوظات کو ب القول الجلی و اسرار الخفی میں قلمبند کیا تھا، شاہ صاحبؒ نے اس کتاب کو خود ملاحظہ لیکن اس کتاب میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اور مصنف نے شاہ صاحبؒ ہ اس میں مزید ایک باب کا اضافہ کیا۔[1]

لی کا نسخہ خدا بخش نہایت خوش خط ہے۔ اور خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اس کا ہ انچ ہے۔ تعداد اوراق ۶۵ ہیں۔ اور اگر اوراق کو صفحات میں تبدیل کیا صفحات ہوتے ہیں ہر ورق پر ۲۹ سطریں ہیں اور ہر سطر میں ۳۰ سے ۳۵ تک الفاظ ہیں۔ موجود م ثانی اور قسم ثالث موجود ہے۔ قسم ثانی میں شاہ صاحبؒ کے ملفوظات ظ افادہ کے عنوان سے تحریر ہے۔ لفظ افادہ ہر جگہ سرخ روشنائی سے لکھا گیا یں شاہ صاحبؒ کے بزرگوں، اعزہ، خلفاء اور احباب کا ذکر ہے۔ اور بھی سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ اختتام پر صرف

ہلوی کے سیاسی مکتوبات، ضمیمہ ۳، ص ۲۱۰، [2] شیخ محمد عاشق نے القول الجلی کے علاوہ دو رشاد اور شرح دعاء الاعتصام یادگار چھوڑی ہیں۔ ص ۲۰۔

والحمد للہ تعالیٰ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً

تحریر ہے اور اس کے دائیں اور بائیں طرف کسی نے بعد میں :

اللھم ارحم علی محمد عمہ ما یرید حبیبک صلعم کا اضافہ کر دیا ہے۔

طرزِ تحریر، کاغذ اور روشنائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اٹھارہویں صدی کا نسخہ ہے۔ کتاب کے شروع میں کوئی نام تحریر نہیں ہے۔ ورق ۲۵ الف پر القول الجلی سرخ روشنائی سے حاشیہ پر تحریر ہے۔ اور قسم ثالث کے شروع میں حاشیہ پر "قسم ثالث القول الجلی" تحریر ہے۔ پورے نسخے میں پانچ جگہ مہر ثبت ہے۔ مگر چار جگہ اس قدر مدھم ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ ورق ۴۱ ب پر قدرے صاف اور غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے۔ مہر اس طرح ہے

العبد المذنب ولایت علی

سنہ ۱۲۶۹ ہجری

یہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ نسخہ خدا بخش ناقص الاول ہے اور موجودہ نسخے میں صرف قسم ثانی اور قسم ثالث ہے۔ قسم ثانی کی شروعات اس طرح ہے :

"قسم ثانی در پارہ کلمات ارشادیات۔ باید دانست کہ کلمات قدسیہ حضرت ایشاں کہ در بیان علوم مغض، اسرار از حقایق لاہوتیہ و جبروتیہ و معارف لدنیہ کہ دست فہم و ادراک ہر اہل ذوق و وجدان بدامن آں نرسد۔ پس ایراد آنہا دریں رسالہ کہ بنا بر آں بر تعمیم افادہ کافہ خصوص و عموم است سودی ندارد و اگر صاحب استعدادی بر شوق اطلاع آں دقایق دارد باید کہ از کتاب تفہیمات الٰہیہ و حجۃ اللہ البالغہ و خیر کثیر و لمعات و ہمعات و الطاف القدس و فیوض الحرمین وغیرہ از مصنفات کرامت آیات طلب نماید۔ اما بعض انفاس نفیسہ متضمن دقایق و آداب مبداء سلوک و معاد

ں کہ در ارشاد مستفیضان جناب ولایت تحریراً یا تقریراً صدور یافتہ بود
یار دایۃً بالفظاً و نقلاً بالمعنی ایں رسالہ را متجلی و مزین می سازد، اللہ تعالیٰ
ں والموفق" ؎۱

بعد شاہ صاحبؒ کی ہر تقریر یا ملفوظ افادہ کے عنوان سے تحریر ہے۔ اور افادات
۰ا ہے؛

دہ جذب صوری درمیان مرشد و مسترشد . .
دہ باید دانست کہ مردم در جبلت یکساں نیستند . . . .
ادہ اکثر اشخاص کہ رغبت راہ خدا دارند . . . . .
فادہ جذب تمام از سینہ می باید برآورد . . . . .
فادہ بسوی امر منزہ متوجہ می باید شد . . . . (۶) افادہ بسا می بود کہ
صل می شود . . . . (۷) افادہ یقین باید کرد کہ آدمی فی الحقیقت عبارت
یہ اوست . . . . . (۸) افادہ غوث الاعظم الشیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ ازیں
ادہ تغیری فرمایند . . . . . (۹) افادہ قلت طعام و دوام صیام . . . .
سالک چوں عزلت اختیار کند . . . . (۱۱) افادہ کسی را کہ توحید منکشف شد۔
یا اتفاق می افتد کہ سالک . . . . (۱۳) افادہ فنا نفس و صغار نفس . . . .
ا نیک تامل کردیم . . . . (۱۵) افادہ باید دانست کسے کہ مالوف باحساس
(۱۶) افادہ سالک را گاہے تشویش روی دہد . . . . (۱۷) افادہ حضرت
ں قدس سرہ . . . . (۱۸) افادہ مدرک حق سبحانہ باد را کہ . . . .

ں ورق۔ الف

(۱۹) افادہ باید دانست کہ احوال نبی آدم . . . . (۲۰) افادہ چوں بدانستی کہ ظل
گیتی . . . . (۲۱) افادہ قیام لیل و سبق باطن . . . . . (۲۲) افادہ شجاع
را در حرب تواں دانست . . . . . (۲۳) افادہ کشف و کرامات علوم . . . . .
(۲۴) افادہ اعلم ان اصل السعادت . . . . (۲۵) افادہ حضرت ایشاں فرمودند
کہ سالک سبیل حقیقت . . . . . (۲۶) افادہ بعد وصول بذات . . . . (۲۷)
افادہ سالک را از وظائف ظاہرہ . . . . . (۲۸) افادہ در ہمہ حال در توجہ حضرت
. . . . (۲۹) افادہ رباعی . . . . (۳۰) افادہ کیفیتی کہ حاصل می شود . . . . . .
(۳۱) افادہ حضرت ایشاں رباعی چند در بیان بعض قواعد سلوک نظم فرمودند . . . . (۳۲)
افادہ اگر خواہم کہ لطیفۂ قلب کسی را . . . . (۳۳) افادہ حضرت ایشاں ارشاد فرمودند
کہ تکمیل بجز بہت . . . . (۳۴) افادہ حضرت ایشاں فرمودند کہ نقطۂ لاہوت . . . .
(۳۵) افادہ حضرت ایشاں ارشاد فرمودند کہ اگر وجود کل . . . . (۳۶) افادہ
حضرت ایشاں فرمودند کہ ارواح مردماں . . . . (۳۷) افادہ خواجہ محمد امین بفقیر
راقم ارقام نمودند . . . . . (۳۸) افادہ نیز خواجہ موصوف نگارش نمودند . . . . .
(۳۹) افادہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . . . . (۴۰) افادہ بجناب ایشاں سالکی
(۴۱) افادہ ارشاد فرمودند کہ چون تجلی اعظم . . . . (۴۲) افادہ ارشاد فرمودند کہ
تحقق عصمت انبیاء . . . . (۴۳) افادہ ارشاد فرمودند کہ توجہ ملائکہ . . . . (۴۴)
افادہ روزی سخن در غیرت ارواح . . . . (۴۵) افادہ نفس ناطقہ کہ با روح . . . .
(۴۶) افادہ فرمودند کہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر . . . . (۴۷) افادہ فرمودند کہ
علم بر دو نوع است . . . . (۴۸) افادہ معروض داشتم کہ مبتدیان . . . . (۴۹) افادہ

...دی . . . . . (۵۰) افادہ معروض داشتم کہ در حدیث . . . .
...زیہ معنی حدیث . . . . . (۵۲) افادہ ارشاد فرمودند کہ نسبت۔
...ند سعادت دنیوی منقسم . . . . . (۵۴) افادہ انبعاث میل بسوی
. . (۵۵) افادہ ارشاد فرمودند کہ طبقات پاس . . . . (۵۶) افادہ
...لے عطی از علوم . . . . (۵۷) افادہ ارشاد فرمودند کہ حکمت در شفاعت
...) افادہ ارشاد فرمودند کہ کمل اولیاء راہم حیرت می باشد . . . . .
...ودند کہ حضرت والد بزرگوار و عم گرامی قدر . . . . (۶۰) افادہ
...این بیت ہندی کہ منسوب است بجناب حضرت محبوب صمدیت
...ا قدس سرہ[1] . . . . . (۶۱) افادہ فرمودند کہ حصول نسبت . . . . .
...دند کہ رسالہ حضرت شیخ تاج الدین سنبھلی . . . . . (۶۳) افادہ
...ت اولیہ . . . . . (۶۴) افادہ بتقریب تمثیل تاثیر صحبت فرمودند...
...فرمودند کہ ہنگام زیارت کعبہ . . . . (۶۶) افادہ سخن در ذکر

...ہندی بیت یہ ہے۔ ؎

...ری چاندنی راتا نکلی پو جیھو پتیم ماتا

...ری (م ۱۰۹۰ ھ) شاہ ولی اللہ کے بڑے چچا تھے، علوم ظاہری کی تکمیل حافظ ...ت الصدق خواجہ باقی باللہ سے تصوف کی تعلیمات حاصل کیں، شروع میں دربار ...جلد ہی اس سے کنارہ کش ہو کر مسجد فیروزہ باد کے قریب ایک حجرے میں رہنے لگے، ...عالم تھے، درس تدریس کا بھی شوق تھا۔ آخری زمانے میں صرف مشکوۃ اور ...پسند کرتے تھے وعظ میں بڑی تاثیر تھی، نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ کہتے تھے احادیث کا

بعض رجال معرین . . . . . (۶۷) افادہ ارشاد فرمودند کہ شیخ عبد الرحمن تمیمی . . . . (۶۸) افادہ ارشاد فرمودند کہ طائفہ از مجذوبین . . . . . (۶۹) افادہ در ضمن تقریر استعدادات نفوس (۷۰) افادہ ارشاد فرمودند کہ حکمت در سکوت . . . . . (۷۱) افادہ در اثنائی تقریر بر معنی این حدیث . . . . . (۷۲) افادہ فرمودند سعادت ہر ذکی و غبی درین راہ . . . . . (۷۳) افادہ فرمودند میراث انبیاء علیہم السلام . . . . . (۷۴) افادہ ارشاد فرمودند کہ طائفہ از مقربین . . . . . (۷۵) افادہ ارشاد فرمودند کہ خرابی آدمی از خطرات نفس اوست . . . . . (۷۶) افادہ خوف سیفی است از سیوف الہی . . . . . (۷۷) افادہ در معنی حدیث الدنیا سجن المومنین . . . . . (۷۸) افادہ ارشاد فرمودند کہ بعض بندگان الہی . . . . . (۷۹) افادہ ارشاد فرمودند کہ توجہ الی اللہ . . . . . (۸۰) افادہ در علاج ازالہ رذائل باطن . . . . (۸۱) افادہ فرمودند عقلاء زبان مقرر دارند . . . . . (۸۲) افادہ فرمودند غیرتہا مشایخ روزگار . . . . . (۸۳) افادہ فرمودند از دہ دستی اکبر علی سلطنت . . . . . (۸۴) افادہ فرمودند تفضیل عالم بر عابد . . . . . (۸۵) افادہ عزیزی بخدمت ایشان ذکر کرد کہ . . . . . (۸۶) افادہ در شرح حکمت مشروعیہ . . . . . (۸۷) افادہ ارشاد فرمودند آدمی قبل انکشاف . . . . . (۸۸) افادہ ارشاد فرمودند کہ کشف بعض معارف . . . . . (۸۹) افادہ ارشاد فرمودند کہ حق تعالی با ماہیت . . . . . (۹۰) افادہ در تفسیر آیۃ کریمہ یدبر الامر من السماء . . . . . (۹۱) افادہ التماس نمودم از معنی این قول . . . . . (۹۲) افادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸) فارسی اور ہندی میں ترجمہ بیان کرتے تھے۔ ملاحظہ انفاس العارفین، ص ۱۰۹، اسعد محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کا خیال ہے کہ مذہبی کتب کو عوامی زبان میں منتقل کرنے کی اہمیت کو سب سے پہلے انھوں نے ہی محسوس کیا تھا۔ تاریخ مشائخ چشت۔ جلد ۵، ص ۹۰۔

م کہ مشاہدۂ صورت ...... (۹۳) افادہ معنی حدیث شریف
...... (۹۴) افادہ در تخصیص عشرہ مبشرہ ...... (۹۵) افادہ
. (۹۶) افادہ فی تمیز الملتبسین ...... (۹۷) افادہ در حدیث
... (۹۸) افادہ حدود جوامع العلم عنی ...... (۹۹) افادہ
...... (۱۰۰) افادہ تورع و اتقا شبہات اصلی است .....
بدا فیاض ...... (۱۰۳) افادہ در قواعد طب ثابت شدہ
ای طبیعت کلیہ کہ بمنزلہ فرس فطون ...... (۱۰۴) افادہ
ہ ...... (۱۰۵) افادہ در دعا ہای بنی آدم بحظیرۃ القدس ....
ی دہر واقعہ عجیبہ ...... (۱۰۷) افادہ تحقق از مستحلان مزامیر
فادہ بعض صفات محمودہ یا صفات غیر محمودہ .....

ں کے احوال پر مشتمل ہے۔ جن میں شاہ صاحبؒ کے قرابت
ی، احباب اور، جلہ خلفاء شامل ہیں، اخیر میں مولف نے
ر کئے ہیں۔ قسم ثالث کے شروع کی عبارت درج ذیل ہے۔

ر احوال و اقوال بزرگانی کہ بحضرت ایشان نسبتی و قرابتی
ر کہ شیخین جلیلین کہ خال کبیر و خال صغیر حضرت ایشانند شروع
اتب الحروف است۔ اگر توفیق الٰہی رفیق شود در ذکر باتم

ں۔ کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے باصرار تمام فرمایا کہ تم اپنے حالات
نے پر انھوں نے خود مختصراً میرے حالات لکھے۔ مولف نے شاہ صاحب
ن ۵۵ ب سے ۶۰ ب تک نقل فرمایا ہے پھر تفصیل بیان کی ہے۔

جناب مع ذکر بعض اصحاب رسالہ مستقلہ ترتیب دہد۔ اما در ایں رسالہ ہم کہ مبنی است بر ذکر بزرگان این خاندان عالیشان کہ این بندہ بشرف ادراک سعادت خدمت شان مشرف گشت بذکر پارہ از حالات کرامت آیات و کلمات معرفت سمات و خیرہ اندوز سعادت دو جہانی گشت تا اگر ثانیاً حال بتائید الٰہی بامضائے آن عزیمت موفق گردد بمصداق ہو المسک ما کررتہ یتضوع خواہد بود و الا نہ بحکم مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ بالکلیۃ از ان دولت محروم نماند و چون این قسم موضوع برای ذکر بزرگانی است کہ بحضرت ایشان نسبتی و قرابتی دارند قاعدہ الاقرب فالاقرب میخواست کہ ذکر احوال کرامت اشتمال ہر دو برادر آنجناب تقدیم یابد لیکن امتثالا لامر ولی الامر کہ خالی از حکمت دیگری نیست ذکر شیخین مقدم کردہ شد۔"

مولّف نے ان بزرگوں نے ملفوظات کا انتخاب بھی 'افادہ' کے ذیلی عنوان سے ہر ایک کے ذکر کے ساتھ دیا ہے۔

۱۔ شیخ عبید اللہ خاں کبیر حضرت ایشان[1] (۲) شیخ حبیب اللہ خاں صغیر حضرت ایشان[2] (۳) شیخ صلاح الدین برادر خورد[3] (۴) شیخ اہل اللہ برادر خورد[4] (۵) شاہ نور اللہ خلیفہ و از قدمائے اصحاب و کملائے احباب (۶) حافظ عبد الغنی المخاطب بہ عبد الرحمٰن از خلفائے معتبر۔ (۷) خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی اجلۂ احباب (۸) میاں محمد شریف خلیفہ حضرت ایشان (۹) مولوی شرف الدین محمد از خواص تلامذہ۔ (۱۰) تذییل در حکایت حال عبد ذلیل بندہ مولف این رسالہ۔

---

[1] مولف کے والد بزرگوار [2] مولف کے عم محترم [3] شیخ صلاح الدین شاہ عبد الرحیم کی محل اولی سے تھے۔
جو خواجہ یوسف قتال کی اولادوں سے تھیں۔ شیخ صلاح الدین طبیب حاذق تھے، اور فن سپہگری کے ماہر
[4] وفات ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء۔

خ محمد عاشق، شیخ عبداللہ کے صاحبزادے، اور شیخ محمد کے پوتے تھے، یعنی وہ
ون زاد بھائی تھے، شیخ محمد عاشق کی ولادت بمقام پھلت ضلع مظفرنگر
یہ مطابق ۲ مارچ ۱۶۹۹ئہ کو ہوئی۔ محمد غازی سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔[1]
سیپارے، تمام کرچکے تو ان کے نانا شیخ عبدالوہاب[2] نے قرآن مکمل کرایا۔
اب صبیان کی تعلیم دی۔ بعد ازاں میزان صرف اور بوستان سعدی
ے تمام کی اور کتب تحصیلہ اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔ کافیہ قدوری
چچا شیخ حبیب اللہ سے مکمل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار سے باطنی تعلیم

شق اوائل عمری سے شاہ عبدالرحیمؒ کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے،
لی اللہؒ سے ایک خاص انسیت تھی۔ ان کی محبت اور رفاقت سے
ت متاز تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:۔

این ہر دو اخلاص بسیار است و با بسیار خوش و راضی مستیم۔[3]

عاشق اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ب جب شاہ عبدالرحیمؒ وضو کے لیے بیٹھے تو میں ان کے سامنے سے
نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان کے (شاہ ولی اللہؒ) کے شرح ہدایہ
ں میں شریک نہیں ہوتے تو میں نے لڑکپن کی شرارت میں عرض کردیا کہ
ی نہیں فرماتے۔ اتنے میں وہ (شاہ ولی اللہؒ) ادھر سے گذرے تو شاہ
ان کا دامن پکڑ کر مجھ سے فرمایا اسے تھام لو۔[4]"

---

۱۰ ب شیخ محمد عاشق عمر میں شاہ ولی اللہ سے تقریباً ۵ سال بڑے تھے۔ [2] ایضاً۔ شیخ
الرحیمؒ کے ہم عصر بزرگ تھے۔ اور سلوک و احسان میں ممتاز تھے۔ [3] ایضاً [4] ایضاً
الف۔

پھر تو یہ دامن ایسا ہاتھ میں آیا کہ تادم واپسیں نہ چھوٹا۔ شیخ محمد عاشق خلوت و جلوت، سفر و حضر اور تصنیف و تالیف سب میں شاہ ولی اللہؒ کے رفیق رہے، شاہ صاحبؒ سے انھوں نے شرح تجرید مع حاشیہ قدیم، شمس بازغہ، محکم الاصول، افق المبین اور صحیح مسلم پڑھی۔[1]

۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحبؒ سفر حجاز پر روانہ ہوئے تو شیخ محمد عاشق ان کے رفیق سفر تھے دوران قیام حجاز انھوں نے شاہ صاحبؒ سے تفسیر بیضاوی سے سورہ فاتحہ کی تفسیر پڑھی اور شیخ ابوطاہر کردی مدنی سے صحیح بخاری اور دارمی کے سبق میں شاہ صاحب کے ہم سبق رہے، اور بقول خود شاہ صاحبؒ کے طفیل میں اس کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔[2]

دوران قیام حجاز شیخ محمد عاشق برابر شغل طریقت میں منہمک رہے۔ اور ہر قدم پر انھیں شاہ صاحب کی رہنمائی حاصل رہی۔ معارف حرمین کی سعادت خطاب سب سے پہلے انھیں حاصل ہوئی۔ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"در ہمہ معارف حرمین مستعد بسعادت خطاب بلکہ رسالہ فیوض الحرمین بالتماس ایں عبد ضعیف مولف گردید و بسعادت تبلیغ ایں خاکسار مستعد گشت۔"[3]

شاہ صاحبؒ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ان کے نام معنون کی۔

"کتاب حجۃ اللہ البالغہ کہ از عمدہ تصانیف آنجناب در علم خاص اسرار شریعت

---

[1] ایضاً۔ القول الجلی ورق ۱۶۱ الف . . . .

[2] ایضاً۔ ورق ۱۶۲ الف [3] ایضاً ورق ۱۶۱ ب شیخ محمد عاشق حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک عربی شعر لکھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ حضرت بار بار مجھے یہ مجھے یہ لکھا کرتے تھے۔ ؎

وَاِنِّی وَاِنْ خَاطَبْتُ اَلْفَ مُخَاطَبٍ فَاَنْتَ الَّذِیْ اَعْنِیْ وَاَنْتَ الْمُخَاطَبُ

(میں ہزار لوگوں سے مخاطب ہوا، لیکن میرا مدعا تو ہے۔ اور تو ہی میرا مخاطب ہے۔)

م کتریں فدویان است ۔[1]

انی تصنیف الخیر الکثیر انھیں سبقاً سبقاً پڑھائی اور اس کے دقائق حل

انہ میں جب شاہ صاحبؒ کو رسول اکرمؐ کی زیارت نصیب ہوئی تو

شق ہی ان سے مستفید ہوئے۔ فرماتے ہیں :۔

جدید حضرت ایشاں بطریق اویسی از روح کریمہ حضرت خاتم الرسل

علیہ اول کسے کہ بشرف بیعت آنجناب مشرف شد ایں بندہ است[2]

ت در شب قدر فی ثلث الاخیر در حجر کعبہ تحت میزاب الرحمۃ بود

ذٰلک "[3]

وقع پر کچھ اسی قسم کی نعمت سے شاہ صاحبؒ نے آپ کو دوبا سرفراز فرمایا[4]

عت ازاں سفر کرامت اثر حضرت ایشاں در واقعہ بجناب حضرت

وسلم بیعت نمودند و از آنجناب بافاضۂ رحمت خاص ختمیہ ممتاز شدند،

واقعہ مبارکہ بخدمت کرامت منقبت حضرت ایشاں بآں حیثیت

مد ذایں عبودیت بنا بود، تلکہ بیعت ثالثہ ۔ وایں عبد ضعیف آنچہ

دت ہر دو جہاں میدارد ہمیں بعینہا سہ گانہ است و بس

حمد اً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ "[5]

شاہ صاحبؒ کے مونس و غمخوار شاگرد، مرید و عزیز تھے شاہ صاحبؒ کو ان سے

ان کا انتقال پھلت ضلع مظفر نگر ۱۱۸۷ھ میں ہوا ۔

ایضاً ۳ھ ایضاً ۔ یہ امر تعجب ہے کہ شیخ محمد عاشق نے اپنے بیعت

کیا ہے ۔ ۴ھ ایضاً ورق ۲۱ ب ۵ھ ایضاً ورق ۶۳ الف ۔

مطبوعات جدیدہ

الجامع لشعب الایمان الجزء الاول والجزء الثانی } تالیف امام حافظ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی تحقیق و تحشیہ ڈاکٹر عبدالعلی عبدالحمید حامد، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت بہت عمدہ، صفحات اوّل ۵۰۰ و ثانی ۸۰۰، مجلد قیمت تحریر نہیں، پتہ الدار السلفیہ ۶/۸ اے حضرت ٹیرس شیخ حفیظ الدین روڈ، بائیکلہ برج بمبئی ۴۰۰۰۰۸ ۔

امام بیہقی پانچویں صدی کے نامور محدث تھے۔ حدیث و فقہ دونوں میں ان کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ اور ان میں ان سے متعدد و بلند پایہ تصنیفات یادگار ہیں۔ حال میں مصر اور عرب ملکوں میں اس قابل ذکر کام ہوا ہے، مولانا تقی الدین ندوی مظاہری شیخ الحدیث عین یونیورسٹی نے امام صاحب کی مشہور تصنیف الزہد الکبیر کو ایڈٹ کر کے کویت سے شائع کیا ہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی استاذ جامعہ مدینہ منورہ نے المدخل الی السنن کو حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، اب الدار السلفیہ بمبئی نے ان کی اہتم بالشان کتاب الجامع لشعب الایمان کو پہلی مرتبہ ایڈٹ کر کے شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، گزشتہ برس اس کا یہ دونوں جلدیں وہیں سے شائع ہوئی ہیں۔ مصنف علام نے اس کتاب میں مشہور حدیث الایمان بضع وسبعون شعبۃ کے مطابق ایمان کے ستر شعبوں کا ذکر کر کے انکی تشریح و وضاحت کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں دوسری روایات و احادیث کے علاوہ قرآنی آیات اور محدثین کے اقوال سے بھی مدد لی ہے، پہلی جلد میں شعب الایمان سے متعلق حدیث کے بعض طرق نقل کر کے ایمان کی حقیقت و ماہیت وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد ایمان کے پہلے شعبہ ایمان باللہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں اللہ کی اور اس کی صفات و اسماء کی معرفت اور اسکے ذاتی و صفاتی ناموں وغیرہ کی وضاحت مختلف آیتوں اور حدیثوں سے کی ہے۔ اسکے بعد ایمان

رے شعبوں رسولوں، ملائکہ، کتابوں اور تقدیر پر ایمان کا ذکر ہے۔ دوسری جلد میں ایمان کے مندرجہ
شعبوں کا تذکرہ ہے۔ آخرت پر ایمان بعث و نشور بعد الموت، حشر، جنت، دوزخ اور محبت الٰہی،
نوں جلدیں الدار السلفیہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبد العلی نے بڑی محنت سے ایڈٹ کی ہیں۔ حواشی میں
ں کے فرق و اختلاف کی صراحت، آیات و احادیث کی تخریج اور راویوں کے متعلق مستند معلومات
ئے ہیں، اور مقدمہ کے پہلے حصہ میں امام بیہقیؒ کے حالات اور علمی کمالات تفصیل سے قلمبند کئے ہیں اور دوسرے
ں کی اس تصنیف کی اہمیت و نوعیت، سبب تالیف، نہج تصنیف، مختلف کتبخانوں میں اسکے موجود نسخوں
راویوں کے ناموں اور حالات وغیرہ کے بارہ میں ضروری باتیں تحریر کی ہیں، ابتدا میں بعض نسخوں کے
نوں کے عکس بھی دیے ہیں، طباعت کے حسن و دلکشی کیلئے الدار السلفیہ کا نام ہی پوری ضمانت ہے،
جدید آلات طباعت مہیا کر کے قدیم نادر و نایاب اہمات کتب کو اہتمام سے شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

سلام کا نظام طلاق ؛ مرتبہ مولانا شکر اللہ صاحب نعمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت مطبوعہ
فحات ۲۰۲، قیمت ۵ روپے پتے (۱) مدرسہ انوار العلوم مبارکپور، اعظم گڈھ (۲) نعیم بکسیلر،
صدر بازار مئو اعظم گڈھ (۳) مکتبہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) ریوڑی تالاب، وارانسی۔

کتاب میں طلاق پر جو بحث کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں طلاق گو بہت معیوب و
م بعض مخصوص حالتوں میں یہ جائز ہے لیکن اس معاملہ میں طلاق دینے والا آزاد اور مطلق العنان نہیں ہے بلکہ اسے
ں کے اصول و ضابطے کے مطابق طلاق دینی چاہئے۔ اس سلسلہ میں مصنف نے طلاق کی صحیح اور مسنون صورتیں
رتیں، اور بدعی و ناجائز صورتیں بھی اور سب کے احکام بھی بتائے ہیں، آخر میں خلع، ایلاء، حلالہ، عدت، نان نفقہ
ے مسائل بھی تحریر کئے ہیں، انھوں نے ایک مجلس کی تین طلاق کے حکم اور بدعی و حرام طلاق کے وقوع و عدم
ں گفتگو کی ہے، اور اس سلسلہ میں ائمہ فقہ و اجتہاد کے اختلاف اور ہر ایک کے دلائل کا جائزہ بھی لیا ہے۔
نت و مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، اسلامی قوانین اور عائلی مسائل پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ان مسائل
ث، یہ کتاب خاص اس موضوع پر اردو داں طبقہ کو طلاق کے احکام سے واقف کرانے کیلئے لکھی گئی،
روایت و حدیث اور رجال کی جو طویل بحثیں کی گئی ہیں ان کا اور مشکل الفاظ و اصطلاحات کا
ہیں ہو سکتا، کتاب مفید اور خاصی ہے۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔	قیمت ۵۵/=
سیرۃ النبیؐ جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔	۵۵/=
۳۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔	۲۵/=
۴۔ سیرۃ النبیؐ جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔	۵۵/=
۵۔ سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔	۲۰/=
رحمت عالمؐ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔	۶/=
۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔	۱۳/=
۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔	۲۲/=
۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔	۵۵/=
۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔	۲۱/=
۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔	۱۵/=
۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔	۴۰/=
۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔	۱۴/=
۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی)	۴۶/=
۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی)	۳۹/=
۱۶۔ یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات	۳۰/=
۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔	۳۰/=
۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔	۲۶/=
۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں)	۲۶/=
۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ سے خطوط کا مجموعہ۔	۱۷/=
۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے	۳ ۵/=

"منیجر"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ے یکم جولائی ۱۹۸۷ء تک پاکستان کی ہجرہ کانسل کی مشاورتی کمیٹی کا ایک سیمینار اسلام آباد
ان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ساتھ یہ خاکسار بھی مدعو تھا۔
ان پر سو عظیم کتابوں کا انتخاب کرنا تھا۔

ابوالحسن علی ندوی اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، وہ الحمد للہ پہلے سے اب
وری ابھی تک باقی ہے، مزید علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے ہیں، دعا ہے کہ
ی کا سایہ ملک وملت پر تا دیر قائم رکھے، تاکہ ان سے جو مذہبی، علمی اور ملی سرچشمہ بہہ رہا ہے
موتے رہیں، آمین۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی بعض اسباب کی بنا پر اسلام آباد نہ پہونچ
ی صرف اسی خاکسار کو کرنی پڑی، اس میں تقریباً ۳۲ ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے
صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا، صدر محترم اور نمایندوں کا خیر مقدم ہجرہ کانسل کے صدر
وکیٹ اور صاحب نظر وفکر اہل علم جناب اے۔ کے۔ بروہی نے کیا، اس ہجرہ کانسل کے
ی خوش سلیقگی، تن دہی اور بالغ نظری سے کرنے والے جناب نبی احمد بخش بلوچ ہیں،
ں کی وجہ سے اس سے پہلے کئی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اور کئی
، اس کانسل کے سکریٹری ڈاکٹر معز الدین ہیں جو پہلے پاکستان کی اقبال اکیڈمی کے
رسٹی میں اقبال چیر کے وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں، اب ہجرہ کانسل کی تجویزوں کو
ی خدمات اس میں لے لی گئی ہیں، ان کو ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام تک

ت ہے۔

ربیں پاکستان کی دیرینہ روایات کے ساتھ تزک واحتشام، دھوم دھام، مہمانوں
داری، دل نوازی اور دلجوئی کے ساتھ انجام پائیں، شروع کے دو روز کی تقریبیں
ی روز اس کی ایک نشست نتھیاگلی میں ہوئی، جہاں سرکاری حکام نے نمایندوں کا
سباب کی بنا پر اس میں شرکت نہ کر سکا، اس سیمینار میں اسلامی علوم وفنون پر جو سو

کتابیں بحث ومباحثہ کے بعد منظور ہوئیں ان کے نام یہاں پر اس لیے درج کیے جا رہے ہیں کہ ہمارے قارئین بھی اس انتخاب سے باخبر ہو کر اپنی عظیم الشان علمی وراثت سے واقف ہو جائیں، جس فن وار طریقہ سے ان کتابوں کی فہرست تیار کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

---

(۱) **قرآنی علوم**: الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی (۲) **علوم حدیث**: سرو الصحائف (نسخۂ خطیہ) (۳) مقدمہ فی علوم الحدیث، ابن الصلاح (۴) **فن تصوف**: کتاب اللمع، ابو نصر السراج (۵) کشف المحجوب، شیخ ابوالحسن علی ہجویری (۶) کیمیائے سعادت، الغزالی (۷) **اخلاقیات**: کتاب تہذیب الاخلاق، ابن مسکویہ (۸) **تقابل مذاہب**: کتاب الملل والنحل، شہرستانی (۹) **تعلیمات**: الرسالة المفصلة لاحوال المتعلمین واحکام المعلمین، القابسی (۱۰) ایہا الولد، الغزالی (۱۱) تعلیم المتعلم وطریق التعلم، الزرنوجی (۱۲) تذکرة السامع والمتکلم، ابن جماعہ (۱۳) مفتاح السعادة ومصباح السیادة طاش کبری زادہ (۱۴) جامع بیان العلم وفضلہ، ابن عبد البر (۱۵) **فہرست کتب**: الفہرست، ابن الندیم (۱۶) **فلسفہ**: کتاب فی الفلسفة الاولی، الکندی (۱۷) رسالہ حی ابن یقظان، ابن طفیل (۱۸) **نفسیات**: کتاب النفس، ابن باجہ (۱۹) کتاب النفس والروح وشرح قواہما، الرازی، (۲۰) **منطق، طبیعیات، فلسفہ وکلام**: کتاب الاشارات والتنبیہات ابن سینا (۲۱) رسائل اخوان الصفا وخلان الوفا، الرسالة الجامعة (۲۲) محصل افکار المتقدمین والمتاخرین، فخر الدین رازی (۲۳) الکتاب المعتبر فی الحکمة الالہیة، ہبة اللہ (۲۴) حجة اللہ البالغة، شاہ ولی اللہ دہلوی، (۲۵) المواقف فی علم الکلام، عضد الدین الایجی (۲۶) معیار العلم، الغزالی (۲۷) حکمة الاشراق، شہاب الدین سہروردی (۲۸) شواہد الربوبیة، صدر الدین شیرازی

---

(۲۹) **خوابوں کی تعبیر**: خلاصة الکلام فی تاویل الاحکام، جلال الدین شیرزی یا کتاب القادری فی التعبیر، ابو سعید نصر الدینوری (۳۰) **سیاسی افکار ونظام**: رسالہ فی آراء اہل المدینة الفاضلة، الفارابی (۳۱) الطرق الحکمیة فی السلسلة الشرعیة، ابن القیم الجوزی (۳۲) کتاب الاموال، ابو عبید (۳۳) کتاب الوزراء والکتاب الجہشیاری (۳۴) معالم القربة فی احکام الحسبة، ابن الاخوة، (۳۵) **تجارت**: کتاب الاشارة الی محاسن التجارة، ابو الفضل جعفر الدمشقی (۳۶) کارواں کے